بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی پیشکش کا تقابلی مطالعہ

(بہ تخصیص "دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں")

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد زبیر

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۱۹ء

بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی پیشکش کا تقابلی مطالعہ

(بہ تخصیص "دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں")

مقالہ نگار:

محمد زبیر

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

دسمبر، ۲۰۱۹ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے،وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو یجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی پیشکش کا تقابلی مطالعہ (بہ تخصیص "دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں")

پیش کار: محمد زبیر رجسٹریشن نمبر:1381/M/U/F17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر محمود الحسن ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ____________________

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ__________

اقرار نامہ

میں، **محمد زبیر** حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الحسن کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

____

محمد زبیر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کا دفاع کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	viii
اظہار تشکر	ix
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	**۱**
الف: تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیان مسئلہ	۱
iii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۲
iv. تحدید	۲
v. تحقیقی مقاصد	۲
vi. تحقیقی سوالات	۳
vii. نظری دائرہ کار	۳
viii. پس منظری مطالعہ	۳
ix. تحقیقی طریقہ کار	۴
x. تحقیق کی اہمیت	۴
ب: تہذیب و ثقافت تعارف و مفاہیم	۴
i. تہذیب	۴
ii. ثقافت	۷
ج: سفر نامہ کے بنیادی مباحث	۱۰

i. تمہید ۱۰
ii. سفر نامہ کی تعریف ۱۱
iii. اردو میں سفر نامے کی روایت ۱۴
iv. سفر نامہ نگاری کے لوازمات ۱۷
v. سفر نامہ کی اقسام ۲۰
vi. سفر نامہ اور دیگر اصناف اردو میں فرق ۲۲
د: بیگم اختر ریاض الدین: اجمالی تعارف ۲۵
ہ: عطاء الحق قاسمی: اجمالی تعارف ۲۷
حوالہ جات ۳۲
باب دوم: "دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں" تہذیبی عناصر کی پیشکش ۳۵
الف: "دھنک پر قدم" میں تہذیبی عناصر ۳۶
i. سماج کی نظریاتی سطحوں کی پیشکش ۳۶
ii. مذہبی عناصر کی پیشکش ۳۹
iii. نسلی، لسانی اور تاریخی عناصر کی پیشکش ۴۳
ب۔ "گوروں کے دیس میں" تہذیبی عناصر ۵۳
i. سماج کی نظریاتی سطحوں کی پیشکش ۵۳
ii. مذہبی عناصر کی پیشکش ۵۶
iii. نسلی، لسانی اور تاریخی عناصر کی پیشکش ۶۱
ج۔ "دھنک پر قدم" اور گوروں کے دیس میں" تہذیبی عناصر کا تقابل ۶۹
i. اشتراکات ۷۰
ii. افتراقات ۷۲
حوالہ جات ۷۶

باب سوم: "دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں" ثقافتی عناصر کی پیشکش **۸۰**

الف: "دھنک پر قدم" میں ثقافتی عناصر کی پیشکش ۸۰

i. رسم ورواج کی پیشکش ۸۰

ii. تہواروں اور میلوں کی پیشکش ۸۴

iii. رہن سہن اور سماجی روابط و آداب ۸۷

ب: گوروں کے دیس میں ثقافتی عناصر کی پیشکش ۹۲

i. رسم ورواج کی پیشکش ۹۲

ii. تہواروں اور میلوں کی پیشکش ۹۶

iii. رہن سہن اور سماجی روابط و آداب ۹۸

ج: "دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں" کے ثقافتی عناصر کا تقابل ۱۰۵

i. اشتراکات ۱۰۵

ii. افتراقات ۱۰۸

حوالہ جات ۱۱۱

باب چہارم: ماحصل **۱۱۴**

i. مجموعی جائزہ ۱۱۴

ii. نتائج ۱۲۳

iii. سفارشات ۱۲۴

کتابیات ۱۲۵

ABSTRACT

The title of my M.Phil thesis is **"Comparative Study of culture and civilizational elements in Begam Akhtar Riazuddin and Atta Ul Haq Qasmi's travelogues"**. Begam Akthar Riazuddin's travelogue Dhanak par Qaddam and Atta Ul Haq Qasmi's travelogue Goron kay Dais Main are primary sources for this research. The main purpose of this thesis is to find out the important elements of western culture and civilization incorporated in these travelogues and to make comparative analysis in succession. Both travelogues have unique identity which helps in understanding the western civilization and culture in its fervor.

Begam Akhtar Riazzuddin and Atta Ul Haq Qasmi has presented the civilized aspects in relation to social, religious, racial, lingual and historical perspectives in their idiosyncratic way. While describing the religious values Atta Ul Haq Qasmi comes up with unique rhythm,whereas there is a specific irony in description of religious elements in Begam Akthar Riazzuddin writing.

Both the travelogue writers have presented the cultural elements superbly. Begam Akhtar Riazzuddin comes up with massive inclination towards cultural activities of west. She describes the observance of festivals with detail. While Atta Ul Haq Qasmi has critically visualized the living standards of westerns.

During their travel to Europe, Begam Akhtar Riazzuddin and Atta Ul Haq Qasmi profoundly observed the civilization, culture, social and daily life. Both have similar thoughts in some of the matters, observations and tendencies, however disagreement is also observed. Both the writers do praises the high moral values and hatred towards evils like bribery, implementation of merit and values like developing the culture of honesty. Begam Aktar Riazzuddin looks inspired from splendid lifestyle of Europe while Atta Ul Haq Qasmi criticized their lifestyle and way of thinking.

اظہار تشکر

اس مقالے کی تکمیل میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کی صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عابد سیال، کوآرڈینیٹر پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم، انتہائی واجب الاحترام اساتذہ کرام اور خاص طور پر اپنے نگران مقالہ جناب پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن صاحب کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے شفقتوں سے نوازا، اور ہر لمحہ میری حوصلہ افزائی کی۔ دوران تحقیق جہاں بھی مشکل در پیش ہوئی مجھے آسان لفظوں میں سمجھا کر اس مشکل کو آسانی میں بدل دیا اور میں تحقیق کا کام مکمل کرنے میں کامیاب ہوا۔ پروفیسر ڈاکٹر نعیم مظہر صاحب کی رہنمائی میرے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ اس مقالے کی تیاری میں شعبہ اردو کے دوستوں کا بھی بہت تعاون حاصل رہا۔ جن کی مناسب اور بروقت رہنمائی سے یہ اہم کام اپنے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ان میں عرفان طارق، محمد حنیف، حلیم احمد، عاقب جاوید، سلطان محمود اور محمد جمیل نے خصوصی طور پر تعاون کیا۔ اس مقالے کی تیاری میں شعبہ اردو کے جن دیگر دوست احباب اور عزیزوں کا تعاون حاصل رہا۔ ان سب کا احسان مند اور شکر گزار ہوں۔ اپنے والدین اور عزیز رشتہ داروں کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ جن کی محبت اور مسلسل دعاؤں سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اپنی شریک حیات اور بچوں کا بھی ممنون ہوں۔ جنھوں نے اس کام کی تکمیل میں نہ صرف میری ہمت بڑھائی اور اپنے وقت کی قربانی دی۔

آخر میں یہ بندہ اپنے رب کا سب سے زیادہ شکر گزار ہے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ کیونکہ دعاؤں کو شرف قبولیت بخشنا اور مسافر کو اس کی منزل سے ہمکنار کرنا صرف اسی کے ہی احاطہ قدرت میں ہے۔

محمد زبیر

سکالر ایم۔ فل اُردو

باب اوّل:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید:

i. موضوع کا تعارف:

اردو ادب کا نثری اصناف کے حوالے سے دامن بہت وسیع ہے۔ نثری اصناف میں دو بڑی اقسام داستانوی نثر اور غیر داستانوی نثر سامنے آتی ہیں۔ غیر داستانوی نثر میں سفر نامہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ آغاز ہی سے انسان کا فطری تجسس اسے سفر پر اکساتا رہا ہے۔ تاکہ وہ دوسرے علاقوں اور انسانوں کے حالات و واقعات سے آگاہی حاصل کر سکے۔ سفر سے واپسی پر انسان بیتے لمحات اور سفری مصائب و مشکلات دوسروں کو سناتا تھا۔ جب تحریر و اشاعت کا آغاز ہوا تو باقاعدہ سفر نامے لکھے گئے اور یوں سفر نامے کی روایت کا آغاز ہوا۔

سفر نامہ ایسی صنف ہے جو ہر زبان میں لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ سفر نامے کے لحاظ سے بھی اردو کا دامن بہت وسیع ہے۔ اردو ادب میں بہت سے سفر نامے لکھے گئے۔ یہ مختلف خطوں کی ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ مختلف ادیبوں نے جو سفر کیے انھوں نے ان حالات و واقعات اور مشاہدات کو قلمبند کیا۔ ان میں بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی دو ایسے ادیب ہیں جنہوں نے اپنے سفری مشاہدات کو سفر نامے کی صورت میں لکھا۔ میرا مجوزہ تحقیقی مقالہ بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں کے تہذیبی و ثقافتی عناصر کے تقابل پر مشتمل ہے۔ چونکہ سفر نامہ دیگر اصناف کی طرح اپنے تخلیق کار کے ذہنی رجحانات اور میلانات کی عکاسی کرتا ہے اور سفر نامہ نگار اپنے سفر کی روداد ذاتی محسوسات کے حوالے سے مرتب کرتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ دونوں سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں کا ("دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں") تہذیبی و ثقافتی عناصر کے حوالے سے تقابل کیا گیا۔

ii. بیان مسئلہ:

بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی نے سفر ناموں کے میدان میں خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے مغربی سفر نامے ("دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں") دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات سے بھرپور ہیں۔ یہ قارئین کو مغربی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرانے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

جس طرح انہوں نے مغربی باشندوں کی ثقافت، طرز زندگی اور معمولات کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں تحریر کیا۔ اس کا تقابلی مطالعہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔

iii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

اس موضوع بیگم اختر ریاض الدین اور عطاءالحق قاسمی کے سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کے حوالے سے اس سے پہلے ایم-فل یا پی ایچ ڈی سطح پر تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ تاہم دونوں کے سفر ناموں پر جزوی کام ہوا ہے۔ عطاءالحق قاسمی پر ان حوالوں سے تحقیقی کام ہو چکا ہے۔

۱۔ عطاءالحق قاسمی کی کالم نگاری مقالہ نگار میمونہ نیئر ایم فل گورنمنٹ یونیورسٹی کالج لاہور ۲۰۰۴ء

۲۔ عطاءالحق قاسمی- شخصیت و فن مقالہ نگار ثوبیہ نسیم ایم فل اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ۲۰۰۹ء

اس کے علاوہ سفر ناموں پر ان حوالوں سے بھی تحقیقی کام ہو چکا ہے۔

۱۔ اردو سفر نامے- تحقیقی و تنقیدی جائزہ مقالہ نگار منظور الٰہی پی ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۹ء

۲۔ پاکستان میں حج کے سفر ناموں کا جائزہ ۱۹۸۰ تا ۱۹۹۰ مقالہ نگار ایم فل جاوید محمود مہو اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ۱۹۹۳ء

۳۔ خواتین کے سفر ناموں کا فنی مشاہداتی مطالعہ مقالہ نگار صدف فاطمہ پی ایچ ڈی کراچی یونیورسٹی کراچی ۲۰۰۲ء

۴۔ اردو سفر ناموں میں جنس نگاری کا رجحان (۱۹۴۷ء کے بعد) ایم فل مقالہ نگار ذوالفقار علی احسن پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۰۰۶ء

iv. تحدید:

اس مقالے میں بیگم اختر ریاض الدین اور عطاءالحق قاسمی کے سفرناموں "دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں" کو مد نظر رکھ کر ان کے تہذیبی و ثقافتی عناصر کا تقابلی مطالعہ کیا گیا۔

v. تحقیقی مقاصد:

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین اور عطاءالحق قاسمی کے سفر ناموں میں تہذیبی پہلوؤں کا جائزہ لینا۔

۲۔ بیگم اختر ریاض الدین اور عطاءالحق قاسمی کے سفر ناموں میں ثقافتی عناصر کا مطالعہ کرنا۔

۳۔ بیگم ختر ریاض الدین اور عطاءالحق قاسمی کے سفر ناموں (دھنک پر قدم اور گوروں کے دیس میں) کا

تقابلی جائزہ لینا۔

vi. تحقیقی سوالات:

ا۔ بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں اہم تہذیبی پہلو کیا ہیں؟

۲۔ بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں اہم ثقافتی عناصر کون سے ہیں؟

۳۔ مذکورہ سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی پیشکش کے اشتراکات اور افتراقات کیا کیا ہیں؟

vii. نظری دائرہ کار:

تحقیقی مقالے میں بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں تہذیب و ثقافت کی پیشکش کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ دونوں سفر ناموں ("دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں") میں موجود سماجی نظریات، مذہبی، نسلی، لسانی، تاریخی، رسم و رواج، تہواروں، رہن سہن اور سماجی روابط و آداب جیسے اہم عناصر کو جاننے اور ان کا تقابل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مقالے کو اسی نہج پر مکمل کیا گیا ہے۔

viii. پس منظری مطالعہ:

سفر نامے کی روایت کا آغاز یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامہ "عجائبات فرنگ" سے ہوا۔ بعد میں سر سید احمد خان نے "مسافران لندن"، مولانا شبلی نعمانی نے "روم و مصر وشام"، منشی محبوب عالم نے "سفر نامہ یورپ"، قاضی عبد الغفار نے "نقش فرنگ" اور شورش کاشمیری نے "چار ہفتے یورپ میں" سفر نامے لکھے۔ جس سے سفر نامے تحریر کرنے کی روایت پروان چڑھتی چلی گئی۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب "اردو ادب میں سفر نامہ" میں مختلف سفر ناموں کے تنقیدی جائزے کے ساتھ ساتھ سفر نامہ تحریر کرنے کے اصول و ضوابط بھی بتائے۔ انہوں نے سفر نامے کے فنی نقائص کو بھی موضوع بنایا۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی کی کتاب "اردو سفر نامہ انیسویں صدی میں" میں بھی سفر نامہ تحریر کرنے کے اصول وضوابط سے بحث کی گئی اس سے بھی استفادہ کیا گیا۔ اردو کے مختلف رسائل میں مختلف محققین کے تحقیقی مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ یہ مضامین اردو سفر نامہ کے فن کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان مضامین سے بھی استفادہ کرتے ہوئے تحقیقی کام مکمل کیا گیا۔

ix. تحقیقی طریقہ کار:

تحقیق میں بنیادی مآخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی مآخذات سے بھی مدد لی گی۔ اردو سفر نامے پر لکھی جانے والی کتب کو بھی دیکھا گیا۔ اس کے علاوہ اسلوبی مباحث سے متعلقہ مواد تک رسائی حاصل کی گئی۔ مجوزہ موضوع پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالات سے رہنمائی لی گئی۔ تحقیق کا طریقہ کار دستاویزی تھا۔ اس کے علاوہ جس طریقہ تحقیق کو مناسب خیال کیا گیا اس کو اختیار کیا گیا۔

x. تحقیق کی اہمیت:

تحقیقی کام اس نوعیت سے بھی بہت اہم ہے کہ اس مقالے میں اردو سفر نامہ کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں کا تہذیب و ثقافت کے حوالے سے تقابل کیا گیا۔ دونوں سفر نامہ نگاروں نے مغربی تہذیب و ثقافت کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس مقالے میں بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں تہذیب اور ثقافت کے نمایاں عناصر کو اجاگر کیا گیا۔ اس سے نہ صرف اردو سفر ناموں کے ذخیرہ تحقیق میں اضافہ ہو گا بلکہ آنے والے محققین کے لیے کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہو گا۔

ب: تہذیب و ثقافت تعارف و مفاہیم:

i. تہذیب:

ایک معاشرے کے اندر رہتے ہوئے انسان کی انفرادی اور اجتماعی سرگرمیاں مختلف طرح سے انجام پاتی ہیں۔ جن کے لیے تہذیب اور ثقافت کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ اکثر تہذیب اور ثقافت کی اصطلاحات کو ہم معنی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگرچہ تہذیب اور ثقافت میں ربط اور تعلق ہے۔ لیکن ان کا الگ الگ معنوی دائرہ ہے۔ ان کے معانی اور مفاہیم کو پرکھا جائے تو اس کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ان اصطلاحات کو واضح کرنے سے قبل ان کے لغوی مفہوم کو دیکھتے ہیں۔ "تہذیب" کا لفظ عربی زبان کا ہے۔ اس کا مادہ "ھ۔ذ۔ب" ہے۔ عربی لغت میں اس کے معنی "درخت وغیرہ کی تراشی کرنا۔ پاکیزہ اخلاق والا بنانا۔ شعر کی اصلاح کرنا"(۱) درج ہیں۔

> اردو لغت میں تہذیب کے معنی " اصلاح۔ پاک کرنا۔ صفائی۔ آراستگی۔ کسی کتاب وغیرہ کی ترتیب۔ تدوین۔ درست کرنا۔ طرزِ معاشرت۔ رہنے سہنے کا انداز۔ تمدن۔

ذہنی ترقی جو زندگی کے چلن میں کارفرما ہو۔ شائستگی۔ ادب و تمیز"[۲] بیان کیے گئے ہیں۔

اگر لفظ تہذیب کے لغوی معنی کو مدنظر رکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تہذیب تراش خراش، اصلاح، پاکیزگی اور درستی کا نام ہے۔ تہذیب کا تعلق انسانی زندگی کے ظاہری پہلوؤں بالخصوص رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے ہے۔ انسان کا ظاہری حسن تب ہی شائستہ ہو سکتا ہے۔ اگر اُس کا باطن بھی صاف ہو۔ انسان علوم وفنون حاصل کر کے اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکتا ہے۔ جس کا عملی اظہار تہذیب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر ثقافت میں سلیقہ آ جائے تو تہذیب کی شکل میں ڈھل جاتی ہے۔ تہذیب اصل ہے جس طرح ہر لفظ کا معنی ہوتا ہے۔ لیکن معنی کا اظہار لفظ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح تہذیب کا اظہار ثقافت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

تہذیب کا لفظ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ یہ ثقافت کے دائرہ کار سے بڑھ کر مفاہیم کی وضاحت کرتا ہے۔ اگر لفظ "civilization" پر غور کیا جائے۔ تو تہذیب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ civilization کا لفظ civitas سے مشتق ہے۔ لفظ city بھی اسی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مفہوم میں معاشروں کی مجموعی زندگی کا طویل عمل کارفرما ہے۔ civilization کے بارے میں کہا گیا ہے۔

> "Civilization is the process by which a society or place reaches an advancd stage of social and cultural development and organization."[۳]

اردو زبان میں لفظ تہذیب عام طور پر اخلاق سے جڑا ہوا ہے۔ سر سید احمد خان نے سب سے پہلے تہذیب کا لفظ استعمال کیا۔ سبطِ حسن کہتے ہیں: "سر سید احمد خان غالباً پہلے دانشور ہیں جنھوں نے تہذیب کا وہ مفہوم پیش کیا جو انیسویں صدی میں مغرب میں رائج تھا۔"[۴]

تہذیب سے مراد طرزِ معاشرت بھی ہے کہ لوگوں کا رہن سہن کیسا ہے۔ ان کی روایات کیا کیا ہیں۔ سیاست کے بارے میں ان کی سوچ کیا ہے۔ مذہبی عقائد کیا ہیں۔ یہ سارے پہلو تہذیب کے بنیادی عناصر میں سے ہیں۔ ڈاکٹر حسن اختر ملک تہذیب کا مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ہم تہذیب کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو اسے طرزِ زندگی کا نام دے سکتے ہیں۔

اس طرزِ زندگی میں لوگوں کا رہن سہن، سوچ، علوم و فنون، معیشت اور سیاست کے اصول، شاعری اور موسیقی، روایات، مذہبی عقائد، زبان اور رسوم شامل ہیں۔"[۵]

تہذیب کا دائرہ ثقافت کے برعکس بہت وسیع ہے۔ لفظ تہذیب انسانی زندگی کے داخلی اور خارجی تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پھر تہذیب مقام کی قید سے بھی آزاد ہے۔ اس کا وجود دائمی ہے۔ جو ہر دور میں مختلف صورتوں میں موجود رہا ہے۔ سبطِ حسن کا کہنا ہے۔ "تہذیب کے لیے دیہات، شہر، صحرا اور کوہستان کی قید نہیں ہے کیونکہ تہذیب معاشرے کی اجتماعی اقدار اور تخلیقات کا نچوڑ ہوتی ہے"۔[۶]

سبط حسن کے نزدیک تہذیب مقام کی قید سے آزاد ہے اور کسی معاشرے کی اعلیٰ اقدار ہی تہذیب کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ تہذیب کا ظہور انسان کے دنیا میں آنے کے ساتھ ہی وجود میں آگیا تھا۔ جبکہ پروفیسر کرار حسین نے تہذیب کے تین عوامل بتائے ہیں۔ "ایک عامل اس کا مذہب ہے، دوسرا ماحول ہے کہ جس معاشرہ میں وہ رہتا ہے۔ اور تیسرا عامل اس کی تاریخ ہے۔"[۷]

فیض احمد فیض تاریخ کو تہذیب کا لازمی جزو بتاتے ہیں۔ نیز وہ اس بات کو بھی اچھی طرح بیان کرتے ہیں کہ تاریخ کی ابتدا کیسے ہوئی۔ وہ اس کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"تہذیب کا طُول وہ ہے جو کہ اس قوم کی تاریخ ہے۔ تاریخ وقت اور زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔۔۔۔ مثلاً انگریز اپنی تاریخ کم و بیش اُس زمانے سے کرتے ہیں۔ جب کہ وہ سب سے پہلے اس علاقے میں داخل ہوئے۔"[۸]

ایک معاشرے کے لیے تہذیب روح کی مانند ہے جو نہ صرف معاشرے کو زندہ رکھتی ہے۔ بلکہ اس کو متحرک بھی کرتی ہے۔ جیسے روح کے بغیر انسانی وجود کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ ایسے ہی تہذیب کے بغیر معاشرہ اپنا وجود قائم رکھنے سے قاصر ہے۔ تہذیب کے زندہ رہنے کا انحصار اِس کی حرکت پر ہے۔ بصورتِ دیگر یہ زوال پذیر ہو جاتی ہے۔

تہذیب کی منتقلی نسل در نسل ہوتی ہے۔ یہ منتقلی مختلف صورتوں میں ہوتی ہے۔ تہذیب کا ارتقاء معاشرے کا مرہونِ منت ہے۔ مختلف اکائیاں باہم مل کر ایک کُل بن جاتی ہیں۔ ان عناصر میں انسانی افکار، رہن سہن، طرزِ معاشرت، رسم و رواج، عقائد اور سیاسی نظام سبھی شامل ہیں۔

تہذیب کی تشکیل میں بہت سے معاشرتی عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول تہذیب کی تشکیل کچھ یوں ہوتی ہے۔

"بہت سے تصورات، اقدار اور معیار ایسے ہیں جو ہمیں اسلاف سے ورثے میں ملے ہیں، بعض کسی قوم کے اختلاط سے حاصل ہوتے ہیں۔ جبکہ کچھ گردوپیش کے طبعی حالات اور آب و ہوا کی وجہ سے پیدا ہوگئے ہیں اور بعض معاشرے کے تاریخی بہاؤ میں ترقی یا تنزل کی حالت میں پیدا ہوگئے۔ یہی وہ عوامل ہیں جن کے سمجھنے سے کسی قوم کے کلچر کا اندازہ ہوتا ہے۔"(۹)

جمیل جالبی نے تہذیب کی تعریف بڑے جامع انداز سے کی ہے۔ جس سے تہذیب کے مفہوم کو سمجھنے میں مناسب رہنمائی ملتی ہے۔

"اگر تہذیب کے معنوں کو دیکھا جائے۔ تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ لفظ تہذیب ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے جو کہ ہمارے ظاہر سے متعلق ہیں۔ انسان جس طرح اپنی معاشرت اور اخلاق کا اظہار کرتا ہے، وہ اُس کی تہذیب ہے۔ اردو زبان میں یہ لفظ ان ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس میں عربی وفارسی میں مستعمل ہے۔"(۱۰)

تہذیب کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم کو سمجھنے کے بعد اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ تہذیب انسان کے ظاہری پہلوؤں سے متعلق ہے۔ یہ مقام کی قید سے آزاد اور اس کا وجود ہمیشہ کے لیے ہے۔ تہذیب کے بغیر معاشرتی وجود ناممکن ہے۔ یہ معاشرے کو متحرک کرتی ہے۔ انسان کی عمدہ طرز معاشرت اور اعلیٰ اخلاق کا اظہار ہی تہذیب کہلاتا ہے۔ تہذیب نسل در نسل آگے منتقل ہوتی ہے۔ اس کا ارتقاء معاشرے کی مرہون منت ہے۔ تہذیب کے بنیادی عناصر میں لوگوں کا طرزِ زندگی، عقائد، زبان، سماجی نظریات، سیاسی نظام، تاریخ، فنون لطیفہ، روایات اور معیشت شامل ہیں۔ الغرض تہذیب کسی معاشرے کی اجتماعی اقدار کا نچوڑ ہے۔

ii. ثقافت:

بعض اوقات ثقافت کو تہذیب کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ تہذیب کی طرح ثقافت بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ثَقِفَ ہے۔ جس کے معنی زیرکی، دانائی یا کسی کام کو کرنے کی صداقت و مہارت کے ہیں۔
عربی لغت میں اس لفظ کے معنی "نیزہ کو سیدھا کرنا۔ مہذب کرنا۔ تربیت دینا۔ تعلیم دینا۔"(۱۱) درج ہیں۔

جبکہ اُردو لغت کے مطابق "کسی قوم یا گروہ انسانی کی تہذیب کے اعلیٰ مظاہر جو اس کے مذہب، نظامِ اخلاق، علم و ادب اور فنون میں نظر آتے ہیں۔"(۱۲) درج ہیں۔

تہذیب کی اصطلاح فکری اور شعوری ہے۔ اس سے جو عملی طور پر چیز وجود میں آتی ہے۔ جس طرح

انسان کے عادات واطوار ہیں یہ ثقافت کہلائیں گے۔ اب اجتماعی سوچ اور فکر کے لیے "culture" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

ثقافت انسانی داخل اور خاص طور پر انسانی ذہن سے تعلق رکھتی ہے۔ ثقافت کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ معرفت ہے۔ جو واقعات، تاریخ اور ادب سے حاصل کی جائے۔ تمام علوم اسی کے زیر اثر آتے ہیں۔ ان کے بغیر دانشمندی کا حصول ممکن نہیں ہے۔ دل و دماغ کا سکون علوم وفنون کے حاصل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

ثقافت کے اصطلاحی معنوں کو دیکھا جائے۔ تو اس سے مراد مجموعی انسانی طرزِ حیات ہے۔ جو انسان سیکھنے کے بعد انجام دے، یعنی ثقافت ایک اکتسابی طرز عمل کا نام بھی ہے۔ گویا ثقافت ایسی اصطلاح ہے کہ اس میں طرزِ معاشرت کے سارے نمونے سما جاتے ہیں۔ اس میں انسان کے رہنے سہنے کے انداز اور ملنے جلنے کے طریقے سبھی آجاتے ہیں۔ ہر وہ کام جو انسان سیکھ کے انجام دے وہ ثقافت کہلائے گا۔

کلچر اور ثقافت کے مفاہیم کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ کلچر بھی علوم وفنون کی اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کا نام ہے۔ کلچر کی اصل "cult" ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے ثقافت کی وضاحت اس طرح سے کی ہے۔

> "کلچر لاطینی لفظ کلٹ سے اخذ ہے۔ کلٹ ایک محدود قسم کا نظام ہے جو ایک مقام یا علاقہ کا ایک دیوتا مان کر اسے اس سے مختلف قسم کی رسمیں وابستہ کر کے مختلف سماجی، اخلاقی عوامل اور رہن سہن کے اصول متعین کرتا تھا"(۱۳)

مولانا ظفر علی خان نے سب سے پہلے انگریزی کے لفظ کلچر کو 'ثقافت' کے معنی پہنائے۔ اُن کے بعد یہ لفظ بتدریج رواج پاتا چلا گیا۔ اب معاشرے کے مختلف پہلوؤں کے اظہار کے لیے یہی لفظ بولا اور لکھا جاتا ہے۔ "انگریزی لفظ کلچر کو سب سے پہلے مولانا ظفر علی خان نے ہی ثقافت کا جامہ پہنایا۔"(۱۴)

وارث سرہندی نے ثقافت کا مفہوم اس طرح سے بیان کیا ہے۔ "کسی بھی قوم کے اطوار، آداب، رہن سہن، اور طرز کلام کے انداز میں ثقافت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔"(۱۵)

اگر ثقافت کا دائرہ دیکھا جائے تو یہ تمام انسانی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ معاشرے کے رسم و رواج، آداب، طور طریقے، خوراک اور رہائش الغرض روزمرہ زندگی کے سبھی کاروبار اس کے دائرے میں سما جاتے ہیں۔ فیض احمد فیض نے ثقافت کا مفہوم اچھے انداز سے بیان کیا ہے۔

"اس میں زندگی کا جتنا کاروبار ہے سب شامل ہے۔ لباس ہے، زبان ہے، خوراک ہے، رہائش کے طریقے ہیں، رسم و رواج ہیں، آپس میں ملنے جلنے کے طریقے ہیں۔ غرض یہ کہ زندگی کا جتنا روزمرہ ہے جس کو انگریزی میں وے آف لائف کہتے ہیں وہ سب۔ زندگی کا تمام روزمرہ کسی معاشرے کے کلچر کی ناتراشیدہ صورت ہے۔"(۱۶)

دنیا میں جتنی قومیں ہیں ہر ایک کا اپنا مخصوص کلچر ہے۔ کیونکہ قوم کے بغیر کوئی قومی کلچر پیدا نہیں ہوتا اور قومی کلچر کے بغیر کوئی قوم نہیں ہوتی۔ فیض اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔ "کسی بھی معاشرے کے افراد کا طرزِ زندگی جس میں رسم و رواج اور معمولات شامل ہیں ثقافت کہلاتے ہیں۔ ہر قوم کا اپنا ثقافتی تشخص ہوتا ہے۔ یہ انفرادیت اسے دوسری ثقافتوں سے ممتاز کرتی ہے۔"(۱۷)

جس طرح فیض احمد فیض نے ثقافت سے مراد زندگی کے سارے معاملات لیے ہیں۔ اسی طرح حکیم محمد سعید اجتماعی زندگی اور معاملات کو ثقافت کے دائرہ کار میں لاتے ہیں۔ "ثقافت کسی قوم کی اجتماعی زندگی میں جاری و ساری اس روح کو کہتے ہیں۔ جو اس کے تمام اعمال پر حکمران ہوتی ہے۔"(۱۸)

ڈاکٹر عطش درانی کے نزدیک یہ عوامل ثقافت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

"ثقافت پر اثرانداز ہونے والے عوامل میں عقائد، سماجی معیارات، تعلیم، ادب، طبعی حالات، ضرورت، فکر و احساس اور ایجادات اہم ہیں۔ ان میں ہر ایک جزو ثقافت پر ہمیشہ اثرانداز ہوتا رہا ہے۔ کسی بھی علاقے، گروہ یا قوم کی ثقافت ان میں کسی ایک جزو کے بدل جانے سے یہ بدل جاتی ہے۔"(۱۹)

جمیل جالبی کے ہاں تہذیب اور ثقافت کے لیے لفظ کلچر استعمال ہوا ہے۔ جس میں مذہب، علوم، اخلاقیات، معاملات و معاشرت، فنون، رسم و رواج، قانون جیسے سبھی عوامل آتے ہیں۔

ثقافت کا لفظ محض رقص و سرور کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں فنون لطیفہ، رسم و رواج، تہوار، میلے، میل جُول، معاملات اور طرزِ معاشرت سبھی عناصر آتے ہیں۔ ثقافت کا لفظ خود میں ایک مکمل کل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ثقافت سے انسان اپنے طرزِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ طرزِ عمل کے اظہار میں اس خاصیت کا ہونا بھی لازمی ہے کہ وہ معاشرے کے مختلف طبقوں میں یکساں ہو۔ چاہے وہ شادی بیاہ کی رسم ہو یا کھانا پکانے کا طریقہ، یعنی ہر عمل میں یکسانیت کا پہلو ہو۔

انسان نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے وہ امن کا متلاشی رہا ہے۔ آرام اور شائستگی کا طالب رہا

ہے۔ اسی خواہش اور ضرورت کے تحت اُس نے آلات بنائے۔ دشمن سے بچاؤ کے لیے اپنے گھر تعمیر کیے۔ ضروریات زندگی کی تمام چیزیں حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی۔ نئے نئے مذاہب، رسم ورواج، طور طریقے، معاشرت، آلات اور ان کے استعمال کے طریقے، معاشی و معاشرتی نظام اور انسانی تعلقات ثقافت کی وجہ سے پروان چڑھے۔

اگر مجموعی طور پر تہذیب و ثقافت کو دیکھا جائے تو ثقافت سے مراد وہ انسانی سرگرمیاں ہیں کہ جن کو وہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے اپنی اہلیت اور صلاحیت کے مطابق سیکھتا ہے اور ساتھ ہی ان کو آگے اپنی نسلوں میں منتقل کرتا ہے۔ رسم ورواج، رہن سہن، فنون، معاشرت، معاملات، اخلاقیات، قانون، تہوار، سماجی روابط اور وہ ساری عادات اور سرگرمیاں شامل ہیں۔ ان سب کا اکتساب انسان معاشرے کی فرد کی حیثیت سے کرتا ہے۔ یہ سبھی ثقافت کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس کے برعکس تہذیب انسانی زندگی کے داخل و خارج کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جس نے انسانی معاشرے کو تحریک دی ہے۔ تہذیب ثقافت کی تنگ گلی کو وسیع شاہراہ فراہم کرتی ہے۔ یہ کسی بھی معاشرے کی مکمل عکاس ہوتی ہے۔ دنیا میں صرف وہی تہذیبیں زندہ رہتی ہیں جو اپنے طرز فکر کو احسن طریقے سے آنے والی نسلوں تک منتقل کرتی ہیں۔

ج: سفر نامہ کے بنیادی مباحث:

i. تمہید:

انسانی زندگی کا آغاز بھی سفر سے ہوا۔ حضرت آدمؑ نے جنت سے زمین کا سفر کیا۔ قرآن پاک میں مختلف انبیاؑ کے اسفار کے حالات و واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ حضرت نوحؑ نے کھلے پانی کا سفر کیا۔ حضرت یوسف نے کنعان سے مصر تک کا سفر کیا اور حضرت محمدؐ کا مکہ سے مدینہ کا سفر بھی تاریخ کا حصہ ہے۔

انسان فطری طور پر جدت پسند ہے۔ وہ ایک مقام پر مسلسل رہنے سے اکتاہٹ اور بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی اکتاہٹ اسے سفر پر اکساتی ہے۔ اس کی یہ آمادگی سفر کا نقطہ آغاز ہوتی ہے اور یوں مسافت طے کرنا سفر کہلاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں جب کوئی مسافر واپس آتا تو وہ اپنے سفر کی روداد دوسرے لوگوں کو سناتا تھا۔ وہ بھی ان دیکھے علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتے۔ پھر جب تحریر کا آغاز ہوا۔ تو سفر نامہ نگاروں نے واقعات و مشاہدات کو ترتیب دے کر لکھنا شروع کر دیا۔ وہ لوگ جو اپنی مجبوریوں کے باعث سفر نہیں کر پاتے وہ سفر نامہ نگاروں کے تجربات اور مشاہدات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس طرح ان کی جستجو کی

تسکین ہوتی ہے۔ سفر نامہ بنیادی طور پر بیانیہ صنف میں شمار ہوتا ہے۔ جس کا اہم مقصد اپنے مشاہدات کو دوسرے لوگوں تک منتقل کرنا ہوتا ہے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ کا سفر اختیار کرنا باعث مسرت اور قابل فخر تصور کیا جاتا تھا۔اس کی ایک اہم وجہ یورپ کی ترقی اور خوبصورتی ہوتی تھی۔ بہت سے ادیبوں نے وہاں کا سفر کیا اور اپنی سفری روداد کو سفر نامے کی صورت میں بیان کیا۔ وہ اپنے سفر نامے میں وہاں کی معاشرت، معاملات اور طرز زندگی کا تفصیل سے تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس مقالہ میں بھی بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں برطانیہ کی تہذیب و ثقافت کی جو عمدہ طریقے سے عکاسی کی ہے اس کا تقابلی جائزہ لیا جائے گا۔

ii. سفر نامہ کی تعریف:

اردو ادب میں سفر نامہ منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ جس کے لیے سفر اساسی شرط ہے۔ سفر کی روداد کو تحریری شکل میں بیان کرنے کو سفر نامہ کہتے ہیں۔ انگریزی میں سفر نامہ کے لیے لفظ "travelogue" استعمال ہوا ہے۔ عربی میں سفر نامہ کو "معاضرہ مصورہ عن رحلتہ" کہا جاتا ہے۔ سفر نامہ دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ یعنی سفر اور نامہ۔ ان دونوں الفاظ کے معنی اور مفہوم کچھ یوں ہے۔

> "سفر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مسافت طے کرنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اور سیاحت کے لیے نکلنا کے ہیں۔ اردو زبان میں یہ لفظ عربی سے مستعار ہے اور انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔"
>
> "نامہ" فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں خط یا مجموعی طور پر تحریر شدہ عبارت کے ہیں۔ اردو کے علماء نے "سفر" عربی سے اور "نامہ" فارسی سے لے سفر نامہ کی اصطلاح اخذ کی۔ اردو میں سفر نامہ رودادِ سفر یا سفری تجربات، مشاہدات کو رقم کرنے کے ہیں۔"(۲۰)

Wikipedia میں سفر نامہ کی تعریف کچھ یوں ہے۔

> “Travel literature is travel writing aspiring to literary value. Travel literature typically records the experiences of an author through a place for the pleasure of travel. An

individual work is some time called a travelogue or itinerary." (۲۱)

سفر نامہ کے مفہوم کو واضع کرنے میں مختلف ناقدین اور ادباء کی آراء نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ ناقدین اور ادباء نے سفر نامہ کی تعریف مختلف اور منفرد طریقے سے بیان کی ہے۔ جس کی وجہ سے سفر نامہ کی کسی ایک تعریف پر متفق ہونا ناممکن ہے۔ سفر نامہ ایک بیانیہ صنف ہے کہ اس میں سفر نامہ نگار چشم دید واقعات، مشاہدات کو تحریری شکل میں قاری کے سامنے لاتا ہے۔ سفر نامہ کا بنیادی مقصد ہی اپنے تجربات و مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ سفر نامے میں ایک طرف خارجی حقائق و مشاہدات کا اظہار ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف داخلی تاثرات کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے سفر نامہ کی تعریف یوں بیان کی ہے۔

> "سفر نامہ جس کا شمار اردو کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے۔ یہ چشم دید واقعات پر لکھا جاتا ہے اس لیے سفر اس کی اساسی شرط ہے۔ بادی النظر میں سفر نامے میں انجانے دیسوں کی سیر اور انوکھے مناظر کے مشاہدے کا تصور وابستہ ہے۔ اس لیے سفر میں تخیل کا عنصر فطری طور پر شامل ہوتا ہے اور یہ تحیر انسان کو سفر پر اکساتا ہے۔ سفر کی نوعیت چاہے کیسی ہی کیوں نہ ہو، سیاح یا مسافر اس بات کے آرزو مند ہوتے ہیں کہ وہ تجربات، سفر سے زیادہ آگاہی حاصل کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔" (۲۲)

سفر نامہ کے فن پر جن ادیبوں نے مختلف کتب تحریر کی ہیں۔ ان میں ایک نام ڈاکٹر قدسیہ قریشی کا ہے۔ انہوں نے "اردو سفر نامہ انیسویں صدی میں" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ پیش کیا جو کہ کتابی شکل میں شائع ہوا ہے۔ ان کے نزدیک سفر نامہ ادب کی ایک ایسی صنف ہے کہ جس میں دوران سفر پیش آنے والے واقعات کو تحریری صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ وہ سفر نامہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں۔ "سفر نامے سے مراد داستانِ سفر، رُوداد سفر یا سفر کے قصے کے ہیں جسے تحریری صورت میں پیش کیا گیا ہو۔ انگریزی میں اسے سفر کو بیان کرنے والی متحرک تصاویر یا مصورِ تقریر بتایا گیا ہے۔" (۲۳)

ڈاکٹر خالد محمود کا نام بھی سفر نامہ پر تنقید اور تحقیق کے حوالے سے نمایاں ہے۔ انھوں نے سفر نامے کے فن کو اچھی طرح بیان کیا ہے۔ وہ اپنی تصنیف "اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ" میں سفر نامہ کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔ "سفر نامہ نگار دورانِ سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات کو

ترتیب دے کر جو تحریر لکھتا ہے، وہ سفر نامہ ہے۔"(۲۴)

ڈاکٹر سید عبداللہ سفر نامے کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔"سفر نامہ ایک طرح کی مرقع نگاری ہے جس میں بیانیہ وصفیہ اور تاثریہ جزئیات ایک خاص فن اور سلیقہ سے مرتب ہوتے ہیں۔"(۲۵)

مرزا ادیب یوں رقمطراز ہیں۔

> "سفر نامہ نگار جو کچھ دیکھتا ہے، جو کچھ پاتا ہے، جس مقام سے گزرتا ہے اس کی ساری خوشبوئیں، اس کے سارے باطنی رنگ اور اس کی وہ ساری کیفیات جو سدا پردہ راز میں چھپی ہوئی ہیں ان سب کو سمیٹ لیتا ہے۔ وسائل ذرائع پر تکیہ کر کے یہ چیز ممکن نہیں ہے۔ سفر نامہ نگاری لازماً ایک تخلیقی تجربہ ہے اس کا اطلاق انہی معنوں پر ہوتا ہے جو تخلیقی تجربے سے وابستہ کیے جاتے ہیں۔"(۲۶)

تحسین فراقی نے سفر نامے کے تعریف یوں بیان کی ہیں۔

> "جہاں تک سیر وسیاحت کے محرکات کا تعلق ہے تو عہدِ قدیم سے لے کر اب تک تبلیغ دین، حصول علم، تلاشِ معاش، سیاسی مقاصد اور زیارتِ مقدسہ وہ چند مقاصد ہیں جنہوں نے نسل انسانی کے پاؤں میں چکر ڈال رکھا ہے اور یوں ان متنوع مقاصد کے حامل اسفار نے مختلف سفر ناموں کو جنم دیا ہے جو دیس دیس کی تاریخ، تہذیب، تصور کائنات، رسوم، رواج، عادات، رجحانات، معتقدات، میلانات اور علوم کا ایک وسیع خزانہ سمیٹے بیٹھے ہیں اور جو بعض صورتوں میں تاریخ، تہذیب و تمدن کا اہم مآخذ سمجھے جاتے ہیں۔"(۲۷)

سفر نامہ نگار سفر نامہ میں بصری مشاہدات اور پیش آنے والے تجربات کے ساتھ ساتھ علمی، ادبی، تاریخی، مذہبی، معاشی، معاشرتی اور جغرافیائی حالات کا ذکر کرتا ہے۔ جس سے سفر نامہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ دوسری اصناف کی طرح سفر نامہ بھی غیر زبان ادب کا مرہون منت ہے۔ ذرائع آمدورفت کی ترقی نے بھی ادبی روایت کو پروان چڑھنے اور مستحکم ہونے میں مدد فراہم کی ہے۔

ان مختلف آراء سے سفر نامے کی تعریف واضح ہو جاتی ہے۔ سفر نامہ اُردو ادب کی ایک زندہ اور محرک صنف سے تعلق رکھتی ہے۔ جس پر غور و فکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار صرف سفری تاثرات، جذبات، احساسات، حالات اور تجربات کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ یہ انسان کو نئی راہوں سے متعارف بھی

کراتا ہے۔ اعلیٰ انسانی اقدار اور روایات کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ متعلقہ خطے کی تہذیب و ثقافت کو نمایاں کرتا ہے۔ سفر نامے کے ذریعے وہ کسی خطے کی تاریخ کو بھی بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان ہمیشہ سے نئے خطوں اور علاقوں کی کھوج میں رہا ہے۔ سفر کی بدولت اس نے بہت سے نئے خطوں کو دریافت بھی کیا ہے۔ انسان کا سفر دراصل اس کے لیے وسیلہ ظفر ہے۔ سفر کی ہی بدولت وہ اپنی تکمیل کئے جا رہا ہے۔ سفر کے ذریعے اس کے جذبات کی تسکین بھی ہوتی ہے۔

iii. اردو میں سفر نامے کی روایت:

اردو میں سفر نامے کی روایت کو دیکھا جائے تو اردو کی تاریخ کی طرح مختصر ضرور ہے۔ تاہم اردو میں سفر ناموں کی روایت خاصی مستحکم ہے۔ سفر نامے کو "outdoor" یعنی باہر کا ادب بھی کہا جاتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ اردو ادب کا پہلا سفر نامہ عجائبات فرنگ ہے۔ یہ سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش نے ۱۸۴۷ء میں لکھا۔ جو کہ پہلے تاریخ یوسفی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اردو کا اولین سفر نامہ برطانیہ کی معاشرتی طرز زندگی کی بھرپور کی عکاسی کرتا ہے۔ پروفیسر جمیل احمد انجم سفر نامے کی تاریخ اور ارتقاء کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "'عجائبات فرنگ' اُردو کا پہلا سفر نامہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ پہلی تصنیف ہے جس پر سفر نامہ کی شرائط کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ سفر نامہ ڈائری طرز کا ہے کیونکہ مصنف نے سفر کے تمام واقعات تاریخ وار تحریر کئے ہیں۔"(۲۸)

یوسف خان کمبل پوش کو دنیا کے عجائبات دیکھنے کا بہت شوق تھا اسی لیے سفر نامہ نگار نے اپنے شوق کی تسکین کے لیے یہ مشہور یادگار سفر کیا۔ لندن کے دلفریب مقامات کی سیر و سیاحت کے بعد یہ سفر نامہ تحریر کر کے انہوں نے اردو سفر نامہ لکھنے کی روایت ڈالی۔

اردو ادب کا دوسرا قدیم سفر نامہ "سیاحت نامہ" کو قرار دیا جاتا ہے جسے نواب کریم خان نے تحریر کیا۔ نواب کریم خان کے سفر نامے میں ہمیں لندن کی تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کے مختلف نقوش ملتے ہیں۔ ان سفر ناموں کے بعد اکا دکا مذہبی یا اندرون ملک کے سفر نامے لکھے گئے۔

> "نواب کریم خان ایک سچے مسلمان اور مشرقی اقدار کے دلدادہ تھے۔ سیاحت نامہ میں ان کے جو تاثرات درج ہیں ان سے وہ ردعمل سامنے آتا ہے۔ جو لندنی زندگی نے ان کے دل پر مرتب کیا۔ "سیاحت نامہ" کا قلمی نسخہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے دریافت

کیا اور انھوں نے اس کو استفادہ عام کے لیے شائع بھی کیا ہے۔ "سیاحت نامہ" کی زبان سادہ و سلیس ہے مطالب معانی کو گرفت میں لینے کی قدرت اس سادہ نثر میں بھی موجود ہے اور یہ قاری کو مطالعے اور مشاہدے میں بڑی خوبی سے شریک کر لیتی ہے۔"(۲۹)

سید فدا حسین نے اپنا سفر نامہ "تاریخ افغانستان" ۱۸۵۲ء میں تحریر کیا۔ یہ بھی اردو ادب کے اوّلین سفر ناموں میں شمار ہوتا ہے۔ سر سید احمد خان کے دور میں سنجیدہ لوگوں نے خاص مقصد کے تحت لکھنا شروع کیا۔ "مسافران لندن" سر سید احمد خان کا مشہور سفر نامہ ہے۔ آپ نے ۱۸۶۹ء میں لندن کا سفر اختیار کیا۔ ان کے سفر نامے کے دو اہم مقاصد تھے۔ مسلمانوں کو تعلیمی تحریک دینا اور ولیم میور کے اعتراضات کا جواب لکھنے کے لیے مناسب مآخذات کی تلاش تھا۔ "مسافران لندن" کو محمد اسماعیل پانی پت نے مرتب کیا۔ یہ سفر نامہ رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع بھی ہوتا رہا ہے۔ اس سفر نامے میں انھوں نے برطانیہ اور ہندوستانی معاشرے کا تقابل بھی کیا ہے۔

سر سید احمد خان کے اس سفر نامے کے ذریعے علوم وفنون کی نئی راہیں کھلیں۔ انہوں نے لندن کی طرزِ زندگی کا خود مشاہدہ کیا اور اپنی بصیرت اور عقل کی کسوٹی پر پرکھا۔ آپ کی نظر میں سیر وسیاحت کی حیثیت ثانوی تھی۔ وہ دراصل اپنی قوم اور اس کے مستقبل کی وجہ سے پریشان تھے۔ انہوں نے وہاں کے نظام تعلیم اور طرز معاشرت سے براہ راست واقفیت حاصل کی تاکہ اپنے ملک میں اس کو رائج کر سکیں۔ سر سید احمد خان کو اس بات کا پتہ تھا کہ کسی قوم کی ترقی اور خوشحالی کا دارومدار اپنی زبان میں علوم وفنون کا حاصل کرنا ہے۔ اسی سفر نامے کا ایک اقتباس ہے۔ "اس تمام ترقی کا باعث انگلستان میں صرف یہ ہے کہ تمام چیزیں، تمام علوم وفنون جو کچھ ہے اسی قوم کی زبان میں ہے۔"(۳۰)

محمد حسین آزاد کا سفر نامہ "سیر ایران" بھی اردو ادب کے اولین سفر ناموں میں شمار ہوتا ہے۔ آپ نے علم کی جستجو اور کتب کے حصول کے لیے یہ سفر کیا۔ "سفر ایران" میں کچھ سیاسی مقاصد بھی شامل تھے۔ تاہم ان کا اصل مدعا علمی تشنگی کا ازالہ تھا۔ یہ سفر نامہ ایران کے لوگوں کے طرز معاشرت کا بھرپور عکاس ہے۔ اس مختصر سفر نامے میں محمد حسین آزاد نے اپنے اُسلوب سے اس پر کشش بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں۔

"سیر ایران کی ایک خوبی اس کا خوب صورت دلآویز تحقیقی اسلوب ہے۔ اس اسلوب

کی بیشتر جھلکیاں آزاد دربار اکبری، آب حیات اور نیرنگ خیال میں بھی پیش کر چکے ہیں۔۔۔ یہ سفر نامہ محض معلوماتی نہیں بلکہ ادبی لحاظ سے ایک حقیقی شہ پارہ ہے اور عہد سرسید کے سفر ناموں میں ایک منفرد شان رکھتا ہے۔"(۳۱)

مولانا شبلی نعمانی کا سفر نامہ "روم و مصر و شام" ۱۸۹۴ء میں آگرہ سے چھپا۔ مولانا کا یہ سفر نامہ خالص طور پر علمی مقاصد کے لیے تھا۔ اس سفر کے دوران وہ عرب دنیا کے مختلف کتب خانوں سے بھی مستفید ہوئے۔ انہوں نے مشہور اخبارات و رسائل کا جائزہ بھی لیا۔ عربوں اور ترکوں کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ آپ اردو کے ایک جلیل القدر ادیب تھے۔ ان کے اسلوب میں ایک خاص روانی تھی۔ انہوں نے اپنے دلکش اسلوب اور حقیقت نگاری سے اس سفر نامے کو عمدہ بنا دیا۔ سید سلیمان ندوی نے سفر نامہ "سیر افغانستان" تحریر کیا۔ آپ کا مطالعہ وسیع اور تاریخی شعور گہرا تھا۔ ان کا سفر نامہ زمانہ حال کا رشتہ ماضی اور مستقبل سے جوڑتا ہے۔ آپ نے اپنے سفر نامے میں افغانستان کی سیاسی، معاشرتی، تاریخی، جغرافیائی اور علمی زندگی کو بغور دیکھا اور اس کو اپنے سفر نامہ میں تحریر کیا۔ ممتاز احمد خان نے ایران، ترکی، ہالینڈ، جرمنی اور فرانس کے سفر کے بعد "جہاں نما" سفر نامہ تحریر کیا۔ اس میں تاریخ اور تہذیب کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ تہذیب و معاشرت کے ساتھ ساتھ انہوں نے حسین و دلفریب مناظر کی تصویر کشی بھی کی۔ نواب حامد علی خان نے ۱۸۸۳ء میں مختلف ممالک کے اسفار کیے۔ جس میں جاپان، ہوائی، انگلستان اور مصر شامل ہیں۔ یہ سفر دس ماہ تک محیط تھا۔ ان کا یہ سفر نامہ قریباً کئی ممالک کے حالات و واقعات کی منظر کشی کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید ان کا سفر نامہ "سیر حامدی" اردو کا پہلا سفر نامہ ہے جو کہ پوری دنیا کا احاطہ کرتا ہے۔"(۳۲) مولانا سید احمد مدنی نے "سفر نامہ اسیر مالٹا" لکھا۔ جس میں فرنگی سامراج کی ظلم کی داستانیں تحریر کی گئیں۔

اگر دیکھا جائے تو جدید اردو سفر نامے کی ابتدا ۱۹۶۰ء سے ہوتی ہے۔ جدید سفر ناموں میں سب سے پہلے محمود نظامی نے اپنا سفر نامہ "نظر نامہ" تحریر کیا۔ اس میں انہوں نے مصر، پیرس، لندن اور میکسیکو کی گلیوں، بازاروں اور تعلیمی اداروں کا احوال قلمبند کیا۔ بیگم اختر ریاض الدین نے اردو ادب کے دو مشہور سفر نامے ایک "سات سمندر پار" اور دوسرا "دھنک پر قدم" تحریر کیے۔ ان کے سفر ناموں کی اہم خاصیت ان کا لطیف انداز اور ہلکا پھلکا طنز و مزاح ہے۔ سید احتشام حسین نے "ساحل اور سمندر" کے نام سے سفر نامہ لکھا۔ اس سفر نامے میں سفر نامہ نگار نے لندن اور امریکہ کے حالات زندگی کو نقش کیا۔ اس کے علاوہ یہ چند سفر نامے بہت مشہور ہیں۔ ابن انشاء کا "چلتے ہو تو چین کو چلئے"، مستنصر حسین تارڑ کا "اندلس میں اجنبی"، علی

سفیان کا "آفاقی طلسمات فرنگ" اور شفیق الرحمان کے سفرنامے "دجلہ" نے بہت شہرت حاصل کی۔ جدید سفرناموں میں سفرنامہ نگاروں نے منظرکشی کے علاوہ وہاں کی روایات اور رہن سہن کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے متعلقہ خطے کی ثقافت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

iv. سفرنامہ نگاری کے لوازمات:

سفرنامہ اردو ادب کی دلچسپ صنف ہے۔ اردو ادب کی دنیامیں بہت سے سفرنامے لکھے گئے اور لکھے جارہے ہیں۔ بعض سفرنامے بہت زیادہ مقبول ہوئے ہیں۔ جس کی ایک اہم اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ سفرنامے تحریر کرتے ہوئے فنی تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے۔ اگر اصولوں اور لوازمات کا خیال رکھا جائے تو یقیناً سفرنامے نہ صرف معیاری ہوں گے بلکہ اس کے ساتھ قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کریں گے۔

سفرنامہ تحریر کرنے کے لیے سفر بنیادی شرط ہے۔ سفرنامہ لکھتے ہوئے صرف بس، ریل، جہاز یا مسافروں کے احوال بیان کردینا کافی نہیں ہوتا بلکہ سفرنامہ نگار کو بہت سے داخلی اور خارجی عوامل کو بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ وہ جس علاقے کی سیاحت کے لیے گیا ہے۔ وہاں کی تاریخ، ماحول، جغرافیہ اور ثقافت کا تجزیہ بھی بیان کرنا ہوتا ہے۔ ہلکا پھلکا طنزومزاح اور عمدہ اسلوب سفرنامہ کو دلکش اور پرلطف بنانے میں نمایاں کردار کرتا ہے۔ واقعات نگاری اور منظر نگاری دلچسپ ہو تو وہ سفرنامہ منفرد حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ سفرنامہ میں ادبی حسن کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اگر سفرنامہ میں ادبیت نہ ہو تو وہ زیادہ دیر تک اپنی افادیت اور پہچان برقرار نہیں رکھ پائے گا۔ چنانچہ سفرنامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے سفرنامہ کو موثر بنانے کے لیے ان عوامل اور لوازمات کو پیش نظر رکھے۔

جغرافیہ اور تاریخ کا بیان:

سفرنامہ میں تاریخ اور جغرافیہ کی پیشکش سفرنامے کو مفید بناتی ہے۔ یہ چیز قارئین کے لیے کشش اور دلچسپی کا باعث ہے۔ ابتدائی دور میں جن سیاحوں نے سفرنامے تحریر کیے ان میں سے کچھ مورخ بھی تھے۔ جن میں البیرونی اور ابن بطوطہ کے نام بہت نمایاں ہیں۔ ابتدا میں زیادہ سفر سمندری راستے سے ہوتا تھا۔ تو بحری راستوں کے تجربات، سمندری مہم میں پیش آنے والی مشکلات کو بھی بیان کیا جاتا تھا۔ سفرنامہ نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ تاریخ اور جغرافیہ کا گہرا شعور بھی رکھتا ہو تب ہی وہ کسی ملک کی تاریخ اور جغرافیہ کو عمدہ طریقے سے بیان کرپائے گا۔ سفرنامہ نگار کو چاہیے کہ وہ تاریخ اور جغرافیہ بیان کرتے ہوئے اعتدال سے کام

لے اور غیر ضروری طوالت سے گریز کرے، یہ نہ ہو کہ وہ سفر نامہ کے بجائے تاریخ یا جغرافیہ کی ایک کتاب بن جائے۔

ادبی حسن:

ایک اچھے سفر نامے کی ایک اہم صفت اس کا ادبی حسن ہے۔ ادبیت سے عاری سفر نامہ کی حیثیت ایک سفری روداد سے زیادہ کچھ نہیں ہو گی۔ ادبی چاشنی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ سفر نامہ کی مقبولیت میں ایک اہم کردار کرتی ہے۔ ادبی حسن کا حامل سفر نامہ زیادہ عرصہ تک اپنا اثر بھی قائم رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ سفر نامہ نگاری کے لیے یہ ضروری نہیں کہ لکھنے والا ادیب ہی ہو۔ بہت سے سفر نامہ نگار ایسے بھی ہیں کہ جنہوں نے سفر ناموں سے پہلے کسی دوسری صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ زبان و بیان میں شگفتگی اور تازگی ایک طرف قاری کی دلچسپی بڑھاتی ہے اور دوسری طرف سفر نامہ نگاری کا مقصد بھی پورا ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید

> "ایک اچھے سفر نامے میں ادیب اور سیاح دونوں ہاتھ میں ہاتھ ملا کر چلتے ہیں۔ سیاح اپنے تیز باصرہ سے ماحول کی جزئیات کو خوبصورت، دلکش اور جاذب اسلوب میں بیان کرتا ہے کہ پورا منظر متحرک ہو کر قاری سے ہمکلام ہوتا ہے۔"(۳۳)

منظر نگاری:

سفر نامے کی ایک اور اہم صفت منظر نگاری ہے۔ سفر نامہ نگار کے پاس مرقع نگاری اور جزئیات کے فن کا ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ مختلف مقامات سیاحت کے مناظر کی تصویر کشی کرنا جانتا ہو۔ منظر نگاری کے لیے اچھے قوت مشاہدہ کے ساتھ ساتھ زبان پر عبور حاصل ہونا لازمی ہے۔ تاہم اس فن کو حاصل کرنے کے لیے بہت محنت اور ریاضت درکار ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر مختار الدین احمد

> "سفر نامے میں دو خوبیاں ضرور ہونی چاہییں۔ ایک تو قاری کے دل میں سیر و سیاحت کا شوق پیدا کر دے اور اگر پہلے سے موجود ہے تو سفر نامہ آتش شوق تیز تر کر دے، دوسری طرف یہ کہ منظر کشی ایسی مکمل اور جاندار ہو کہ ہر منظر صحیح اور سچی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔"(۳۴)

سفر نامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ واقعات کی تصویر کشی اس طریقے سے کرے کہ قاری ایسے محسوس کرے کہ وہ واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ عمدہ منظر نگاری سے سفر نامے کی افادیت اور اہمیت

بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

طنز و مزاح:

سفر نامہ میں سنجیدگی کے ساتھ ہلکا پھلکا طنز و مزاح بھی ہونا چاہیے۔ کیونکہ صرف سنجیدگی سے سفر نامہ میں بوریت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ سنجیدگی حد سے بڑھ جائے تو سفر نامہ فلسفہ کی کتاب کی شکل اختیار کر لے گا۔ تاہم ہنسی مذاق کا زیادہ ہونا بھی سفر نامہ کو متاثر کرے گا۔ لہذا ضروری ہے کہ ظرافت اور شوخی کو اعتدال کے ساتھ شامل کی جائے۔ اُسلوب میں طنز و مزاح سے سفر نامہ دلچسپی کا باعث بنے گا جس سے قارئین بوریت کا شکار بھی نہیں ہوں گے۔ جن سفر نامہ نگاروں نے طنز و مزاح کا استعمال اعتدال سے کیا ہے۔ ان کے سفر ناموں نے قارئین کو بہت متاثر کیا ہے۔ اسی سبب یہ سفر نامے مقبول ہوئے اور قارئین ان کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ایسے سفر نامے طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی اپنی مقبولیت نہیں کھوتے۔

حقیقت نگاری:

سفر نامہ میں واقعات کی حقیقی تصویر کشی کرنا پڑتی ہے۔ کیونکہ حقیقت نگاری سے عاری سفر نامہ داستان یا افسانے کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اور ایسے سفر نامے ادب کی دنیا میں نمایاں مقام بھی حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ سفر ناموں میں فضول باتوں اور داستان طرازی کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی۔ سفر نامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ مبالغہ آرائی کے بجائے حقیقت پر مبنی بات کو ترجیح دے۔

تہذیب و ثقافت کا بیان:

سفر نامہ نگاری کے لیے تہذیبی و ثقافتی شعور کا ہونا بھی لازمی ہے۔ کیونکہ سفر نامہ میں تہذیب و ثقافت کے بیان سے اس کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ اس سے قارئین کو اس خطے کی تہذیب و ثقافت سے آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ قاری کسی بھی اَن دیکھے علاقے کے رسم و رواج اور طرزِ زندگی کو جاننے اور سمجھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہی تجسس اسے سفر نامہ پڑھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔

سفر نامہ صرف تاثرات، احساسات اور جذبات کی ہی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ یہ زندگی کی نئی راہوں سے متعارف کراتا ہے۔ اعلیٰ انسانی اقدار و روایات کو فروغ دیتا ہے۔ الغرض سفر نامہ کسی قوم کی تہذیب کو پرکھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

v: سفر نامے کی اقسام:

سفر نامہ بنیادی طور پر غیر افسانوی صنف نثر ہے۔ اس کی موضوع اور مواد کے اعتبار سے کئی اقسام ہیں۔ سفر نامہ میں سفر کے حالات اور واقعات کو دلچسپی سے بیان کیا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار جس خطے کا سفر کرتا ہے۔ اس سے متعلق معلومات قارئین تک پہنچاتا ہے۔ یوں سفر نامہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے معلومات کے خزانے کے ساتھ ساتھ دلچسپی کا باعث بھی ہوتا ہے۔ بعض سفر نامے تاریخی اور جغرافیائی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ کچھ سفر نامے مذہبی آگاہی دیتے ہیں۔ جبکہ بعض سفر نامے متعلقہ خطے کی تہذیب و ثقافت سے روشناس کراتے ہیں۔ سفر نامے میں ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ مقصدیت اور افادیت کے پہلوؤں کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے سفر نامے کی یہ اقسام ہیں۔

مشرقی سفر نامے:

یہ وہ سفر نامے ہیں جو کہ مشرقی ممالک یعنی عرب، ایران، شام، مصر اور ہندوستان کے سفر پر لکھے جاتے ہیں۔ مشرقی سفر ناموں میں عام طور پر اسلامی طرزِ زندگی کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ان ممالک کا رہن سہن، تعلیمی نظام اور ثقافت کو پیش کیا جاتا ہے۔ کچھ سفر نامہ نگار مشرقی ممالک کا مغربی ممالک کی تہذیب و ثقافت سے موازنہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں محمد حسین آزاد کا سفر نامہ "سیر ایران" اور مولانا شبلی نعمانی کا "روم و مصر و شام" شامل ہیں۔

مغربی سفر نامے:

یورپ اور امریکہ کے ممالک ترقی یافتہ ہونے کے ساتھ خوبصورتی کا مظہر بھی ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر سیاحوں نے مغربی ممالک کے سفر کیئے۔ ان سیاحوں نے اپنے سفر ناموں میں مغربی ممالک کی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرایا ہے۔ جو کہ قاری کے لیے معلومات کے ساتھ دلچسپی کا سبب بنتے ہے۔ ان میں مغربی لوگوں کے خیالات و نظریات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مغربی سفر نامے تحریر کرنے کی اہم وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان بہت عرصہ مغرب کے زیر تسلط رہا۔ ہندوستانی تہذیب مغربی کلچر کی یلغار کی نذر ہو رہی تھی۔ اس کو مد نظر رکھتے ہوئے سفر نامہ نگاروں نے اپنی تہذیب و ثقافت کو بچانے کے لیے مغربی سفر نامے تحریر کیے۔ ان میں پطرس بخاری کا سفر نامہ "سفر انگلستان"، سر سید احمد خان کا "مسافران لندن" اور عطاءالحق قاسمی کا "گوروں کے دیس میں" بہت مشہور ہیں۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی کے بقول

> "سر سید احمد خان نے اُس دور میں مسلمانوں کی اصلاح و معاشرت اور مغرب کے نئے سائنسی انکشافات کے بارے میں بہت کچھ لکھا، سر سید تحریک سے لوگوں میں ایک نیا شعور پیدا ہوا، جس کا مرکزی خیال انگریزی علوم سیکھنا اور زندگی کی نئی قدروں کو اپنانا تھا، اسی زمانے میں اکثر لوگ اپنے لڑکوں کو تعلیم کے لیے یُورپ بھیج رہے تھے۔ سر سید احمد خان نے بھی یورپ کا سفر کیا اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی ترغیب دی۔"(۳۵)

مذہبی سفر نامے:

مذہبی سفر نامے عام طور پر حج اور عمرہ کے متعلق لکھے جاتے ہیں۔ یہ سفر نامے حج اور عمرہ پر جانے والوں کی ضرورت کے پیشِ نظر لکھے جاتے ہیں۔ جو کہ زائرین کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تحریریں ایک طرف معلومات فراہم کرتی ہیں تو دوسری طرف جذبہ ایمانی کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ یہ سفر نامے زائرین اور قارئین کو مکہ، مدینہ اور مقدس مقامات سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی کہتی ہیں۔

> "ہر مذہب نے اپنے پیروکاروں کو تاکید کی ہے کہ وہ اُن مقامات کی سفر کریں، جو ان کے مذہب میں مقدس ہیں، اُن کا مقصد طول و طویل سفر سے حاصل ہونے والے تجربے، دوسرے لوگوں سے ملنے کی اہمیت، دوسری تہذیبوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع کی فراہمی بھی ہے۔"(۳۶)

ان سفر ناموں میں ممتاز مفتی کا سفر نامہ "لبیک" اور مستنصر حسین تارڑ کا "منہ ول کعبے شریف" بہت نمایاں ہیں۔

مقامی سفر نامے:

کچھ سفر نامہ نگاروں نے اندرونِ ملک کی سیاحت کا حال بیان کرنے کے لیے سفر نامے لکھے۔ ان میں اکثریت شمالی علاقوں کی خوبصورتی کی عکاسی کرتی ہے۔ ان علاقوں میں چترال، گلگت، ہنزہ، رتی گلی اور کشمیر کے حسین مقامات بھی شامل ہیں۔ یہ سفر نامے ان علاقوں کی خوب صورتی کے ساتھ وہاں کے کلچر اور تہذیب کی تفصیل بھی فراہم کرتے ہیں۔ یہ شمالی علاقہ جات کے دلکش مقامات کی منظر کشی کر کے سیاحت کو فروغ

دینے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ڈاکٹر قدسیہ قریشی کہتی ہیں۔

> "مقامی سفر نامے اس لیے بھی اہم ہیں کہ ان سے ہمیں ہندوستان کی تہذیب، یہاں کی تاریخ، یہاں کی عمارتوں کی تفصیل اور یہاں کے لوگوں کے رہن سہن کا ڈھنگ کا پتا چلتا ہے۔ اس کے علاوہ مناظر قدرت کی عکاسی بھی ان سفر ناموں کا ایک لازمی جزو ہے۔"(۳۷)

اس میں مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ "ہنزہ داستان" اور اعجاز حسین کا "سفر نامہ بلوچستان" بہت مقبول ہوئے۔

مواد کے اعتبار سے بھی سفر نامہ کی کئی اقسام ہیں۔کچھ سفر نامے تاریخی، جغرافیائی یا سیاسی حالات کی عکاس ہیں۔ اردو ادب کے ابتدائی سفر نامے اسی طرز پر لکھے گئے۔یوسف خان کمبل پوش کا مشہوراور اردو کا پہلا سفر نامہ "عجائبات فرنگ" اور ابن بطوطہ کا "تحفتہ الا سفار" اسی قسم کے سفر ناموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ سفر نامے علمی پیاس بجھانے کے لیے لکھے گئے۔ بعض سفر نامے کسی خطے کی سیاسی نظام کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ سیاسی یا سرکاری سفر نامے کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ مرزا ادیب کا "ہمالہ کے استاد" ہے۔ بعض سفر نامے طنزو ظرافت کے لیے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ جن میں سفر نامہ نگار مزاحیہ انداز میں سفر کے واقعات کو رقم کرتا ہے۔ ابن انشاء کا سفر نامہ "دنیا گول ہے" اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔کچھ سفر نامے افسانوی انداز میں لکھے جاتے ہیں۔ جن کا مقصد قارئین کی دلچسپی کو بڑھانا مقصود ہوتا ہے۔ "نکلے تیری تلاش میں" جو کہ مستنصر حسین تارڑ نے لکھا، اس قسم میں آتے ہیں۔ الغرض سفر نامے کی یہ مختلف اقسام قاری کو اپنے منفرد طریقے سے معلومات پہنچاتے ہیں اور ان کی دلچسپی کا سبب بھی بنتے ہیں۔ اس سے قارئین کو اپنی پسند کے سفر نامے پڑھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ قارئین کو اپنے مقامی علاقوں کے متعلق بہت زیادہ آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے۔

vi :سفر نامہ اور دیگر اصناف اردو میں فرق:

جیسے جیسے اردو ادب ترقی کی منازل طے کرتا رہا تو مختلف اصناف کا وجود عمل میں آتا گیا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ تنقیدی کام بھی ہوتا رہا۔ اردو کی مختلف ادبی اصناف پر کافی تنقیدی کام ہو چکا ہے۔ تاہم سفر نامہ کے فن پر تنقیدی کام اتنا زیادہ نہیں ہوا ہے۔ جس کے باعث کچھ غیر افسانوی اصناف کو سفر نامہ میں شمار کیا جانے لگا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سفر نامہ میں بہت سی اصناف کی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ ذیل میں سفر نامہ اور اردو ادب کی دیگر اصناف کے درمیان فرق کو واضح کیا جائے گا۔ تاکہ سفر نامہ کی کوئی جامع تعریف وضع

ہو سکے۔ اور ان میں فرق کرنا آسان ہو سکے۔

سفر نامہ اور داستان میں فرق:

سفر نامہ اور داستان دونوں میں تجسس کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ اردو ادب کی بہت سی کہانیاں سفری روداد پر ہی مشتمل ہوتی ہیں۔ جن میں قصہ چہار درویش، فسانہ عجائب اور داستان الف لیلیٰ بہت نمایاں ہیں۔ دراصل داستان اور سفر نامہ میں بنیادی فرق تخیل اور حقیقت نگاری کا ہے۔ داستان میں داستان نگار تخیل کی بنیاد پر ایک کہانی کی تشکیل کرتا ہے۔ وہ قاری کو ایک خیالی دنیا میں گم کر دیتا ہے۔ وہ تجسس اور دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مافوق الفطرت کرداروں کو بھی کہانی میں شامل کرتا ہے۔ جبکہ سفر نامہ نگار حقیقی دنیا کی سیر کراتا ہے۔ اس میں تخیل کا دخل نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود سفر نامہ اور داستان کا فرق اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "داستان سفر نامہ سے بہت قریب ہے بلکہ داستان خود ایک سفر نامہ ہے جو تخیل کی بلند پروازی کے زیرِ اثر انسانی مشاہدے میں آنے والی سچائیوں سے دور ہو جانے کی وجہ حقیقی سفر نامے سے الگ ہو گئی ہے۔"[۳۸]

سفر نامہ اور روزنامچہ میں فرق:

روزنامہ میں ایک مصنف روزانہ کی بنیاد پر پیش آمدہ حالات و واقعات کو قلمبند کرتا ہے۔ روزنامچہ میں صرف اپنی ذات کی مختلف پہلوؤں کو سمویا جاتا ہے۔ جو کہ اکثر دنیا کی نظروں سے چھپے ہوتے ہیں۔ چونکہ روزنامچہ کا شمار بھی سوانحی اصناف میں ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو بھی سفر نامہ کے قریب تسلیم کیا جاتا ہے تاہم ان دونوں میں بھی فرق ہے۔ ابوذر عثمانی روزنامچہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "ڈائری نجی زندگی کے عمومی احوال، واقعات و کیفیات کے بیان کے ساتھ ڈائری نگار کے کچھ مخصوص مشاغل اور دلچسپیوں کی عکاس ہوتی ہے۔ بسا اوقات اس میں کسی تاریخی واقعے یا سانحہ کا آنکھوں دیکھا حال، کسی سفر کی روداد، مطالعہ کتب کی تفصیل اور علمی و ادبی معلومات پر رائے زنی ہوتی ہے۔"[۳۹]

روزنامچہ میں جن احوال کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ان کا تعلق عام طور پر ذاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ جبکہ سفر نامہ میں سفر کے حالات اور واقعات کا تجزیہ بھی بیان کیا جاتا ہے۔

سفر نامہ اور آپ بیتی میں فرق:

آپ بیتی میں مصنف اپنی زندگی میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کو تفصیل سے پیش کرتا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف کے احساسات وجذبات کو اہم حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس صنف میں چونکہ اپنی ذات کا بیان ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس میں مصنف اپنی ذات کے مثبت پہلوؤں کو بھرپور طریقے سے بیان کرتا ہے۔ وہ جس شہر یا ملک میں رہتا ہے وہاں کے حالات جزوی طور پر بیان کرے گا۔ جبکہ سفر نامہ نگار اپنی ذات کے بجائے سفر کے تاثرات کو اہمیت دیتا ہے۔ سفر نامہ میں سفر نامہ نگار کی زندگی کے عروج وزوال کا بیان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ وہ صرف روداد سفر کو قلمبند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود آپ بیتی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "آپ بیتی سفر نامہ سے اتنی قریب ہے کہ اگر آپ بیتی لکھنے والے کی زندگی اپنے گھر وطن کے بجائے کسی دوسرے ملک، شہر یا علاقے میں گزری ہو تو اس کی خود نوشت بڑی حد تک سفر نامہ ہو جاتی ہے۔"[۴۰] یعنی سفر نامہ تحریر کرنے کے لیے سفر نامہ نگار کو لازمی طور پہ سفر کرنا پڑے گا۔

سفر نامہ اور رپور تاژ میں فرق:

سفر نامہ اور روپور تاژ دونوں میں داخلی اور خارجی کیفیات کا بیان ہوتا ہے۔ اس مماثلت سے سفر نامہ اور رپور تاژ ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ روپور تاژ نگار بھی بہ نفس نفیس حالات وواقعات میں شریک ہوتا ہے۔ جس سے اس کے بیان میں صداقت آجاتی ہے۔ تاہم ان دونوں میں بھی یہ فرق ہے کہ رپور تاژ کے لیے سفر کی شرط ضروری نہیں جبکہ سفر نامہ تحریر کرنے کے لیے سفر کرنا اساسی شرط ہے۔ سفر کی شرط دونوں اصناف میں فرق کو واضح کرتی ہے۔ مرزا حامد بیگ نے سفر نامہ اور رپور تاژ کے فرق کو اس طرح بیان کیا ہے۔

> "سفر نامہ واقعات کی تفصیل پیش کرتا ہے اور رپور تاژ میں پیش آنے والے واقعات سے لیا گیا تاثر اور اس تاثر کی تخلیقی پیش کش میں خارج کی رپورٹنگ کے ساتھ داخلی عناصر اور تخیل کے رنگ کی آمیزی اضافی عناصر ہیں۔ رپور تاژ کے یہی خاصیت ہے جس کے ذریعے مصنف اپنے موضوع کی سماجی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے۔"[۴۱]

اس تعریف سے ان دونوں اصناف میں فرق کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اگر ان دونوں اصناف کا فنی تجزیہ کیا جائے تو دونوں کا مفہوم آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سفر نامہ نگار مختلف مناظر کو دیکھ کر ان کی عمدہ اور

خوبصورت الفاظ میں تصویر کشی کرتا ہے۔ رپور تاژ میں ان کی زیادہ اہمیت نہیں۔ سفر نامہ میں واقعہ کی مرقع نگاری ہوتی ہے۔ جبکہ رپور تاژ میں واقعہ پر صرف رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔ سفر نامہ میں عام طور پر انفرادی محسوسات کا بیان ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس رپور تاژ میں مختلف کرداروں کے احساسات اور جذبات بھی کا بھی تذکرہ ہوتا ہے۔

د: بیگم اختر ریاض الدین: اجمالی تعارف

بیگم اختر ریاض الدین ایک نامور سفر نامہ نگار، صحافی، تانیثیت پسند اور معلمہ ہیں۔ آپ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ آپ نے ۱۹۴۹ء میں Kinnarid College لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے ۱۹۵۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ماسٹر کیا۔ آپ نے تدریس کے شعبے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۵ء تک بطور لیکچرار فرائض انجام دیے۔ یہاں وہ انگریزی ادب پڑھایا کرتی تھیں۔

بیگم اختر ریاض الدین کی شادی میاں ریاض الدین احمد سے ہوئی۔ جو کہ مولانا صلاح الدین کے بھتیجے تھے۔ میاں ریاض الدین احمد ایک سی ایس پی آفیسر تھے۔ بیگم اختر ریاض الدین کی تین بیٹیاں ہیں جن میں سے ایک نگار احمد ہیں۔ جو کہ عورت فاؤنڈیشن کی چیئرپرسن رہی ہیں۔

آپ صحافت کے شعبے سے بھی منسلک رہی ہیں۔ آپ نے مشہور انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز" کے لیے باقاعدہ مضامین لکھے۔ پھر انھوں نے مولانا صلاح الدین کے اصرار پر اُردو میں بھی طبع آزمائی کی اور اُن کے کہنے پر سفر نامہ لکھنے کا بھی آغاز کیا۔

جدید اُردو سفر نامہ نگاری میں ایک نمایاں نام بیگم اختر ریاض الدین کا بھی آتا ہے۔ انھوں نے اُردو کے دو مشہور سفر نامے "سات سمندر پار" اور "دھنک پر قدم" بھی تحریر کیے۔ جو کہ جدید سفر نامہ کے فنی تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔ آپ نے سی ایس پی آفیسر میاں ریاض الدین سے شادی کے بعد مختلف ممالک کے سفر اختیار کیے۔ ان ممالک کی تاریخ و جغرافیہ کے ساتھ وہاں کی سماجی اور تہذیبی زندگی کا تجزیہ بھی عمدگی سے بیان کیا۔ آپ نے سفر نامے لکھتے ہوئے صحافت کے تجربے سے بھی خُوب فائدہ اٹھایا۔ صحافت نے اُن کے افکار و خیالات کو جلا بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بیگم اختر ریاض الدین نے اپنے مشاہدات کو دلچسپ اور پرکشش اُسلوب کے ساتھ قاری کے سامنے بیان کیا ہے۔ وہ طنز و مزاح سے اپنے خیالات کی ترسیل کرنے میں

مہارت رکھتی ہیں۔ڈاکٹر انور سدید ان کے سفر نامہ نگاری پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اختر ریاض الدین منظر پر جامد نظر ڈالنے کے بجائے اسے تخلیقی آنکھ سے دیکھتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فطرتی حسن کو شاعرانہ انداز سے کاغذ پر اتارا ہے۔ ان کے شوخ رنگ قاری پر سحر نظارہ طاری کر دیتے ہیں۔ اختر ریاض الدین کے تاثرات میں نسوانی زاویوں نے جداگانہ نوعیت کی لذت پیدا کی ہے۔ مرد سفر نامہ نگار بالعموم منظر کی قوس قزح کو بکھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اختر ریاض الدین منظر کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو چنتی ہیں اور ان سے منظر کی تصویریوں مرتب کرتی ہیں کہ ایک خوبصورت قوس قزح سامنے آجاتی ہے۔"(۴۲)

بیگم اختر ریاض الدین کی اہم کامیابی یہ ہے کہ آپ نے اردو ادب میں جدید سفر نامہ نگاری کی بنیاد رکھی۔ آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ مختلف ممالک کا سفر کیا اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کا جائزہ لے کر انھیں اپنے سفر ناموں میں قلمبند کیا۔ انہوں نے جس انداز سے قدرت کی رنگینیوں کو خوب صورتی سے تحریر کیا بلاشبہ وہ لائق تحسین ہے۔ پروفیسر جمیل احمد انجم کہتے ہیں۔

"قیام پاکستان کے بعد جن سفر ناموں نے جدید سفر ناموں کی بنیاد رکھی وہ بیگم ریاض الدین کے لکھے ہوئے ہیں۔ "دھنک پر قدم" اور "سات سمندر پار" اپنے حسن بیان، رومانوی اسلوب اور تاثرات کے اعتبار سے بہت عمدہ ہیں۔ بیگم اختر کو اپنے خاوند کے ساتھ سرکاری دوروں پر یورپ، ایشیا اور امریکہ کے متعدد ممالک میں جانے کا موقع ملا۔ اس نے جو کچھ محسوس کیا اسے اپنے ذاتی تاثرات کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔"(۴۳)

آپ نے مزاح کے ساتھ تشبیہات کا بھی خوب صورت استعمال کیا ہے۔ انھوں نے غیر رسمی انداز سے لکھا ہے۔ اُن کے سفر نامے سادہ ہونے کے ساتھ پرکشش بھی ہیں۔ جن میں معاشرے اور تہذیب کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صدف فاطمہ کہتی ہیں۔

"اختر ریاض الدین نے تشبیہات و استعارارت کے ذریعے بھی مزاح پیدا کیا۔ نسوانی پسند کو ہی زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے مزاح پیدا کر کے سفر نامے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ اُن کا اپنا منفرد اُسلوب ہے۔"(۴۴)

بیگم اختر ریاض الدین تانیثیت کی تحریک کے ساتھ بھی منسلک رہی ہیں۔ آپ نے خواتین کو ان کے جائز حقوق دلوانے کے لیے مختلف فورمز پر آواز اٹھائی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مختلف بین الاقوامی

کانفرنسوں میں شرکت کی اور خواتین کے حقوق کے لیے ترجمانی کی۔ آپ نے بطور وفاقی وزیر برائے بہبود خواتین بھی کام کیا۔ جہاں انھوں نے خواتین کے حقوق کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے بیت المال کے بورڈ آف گورنرز کے ممبر کی حیثیت سی بھی فرائض انجام دیے۔

بیگم اختر ریاض الدین کو محنت اور قابلیت کی بنا پر انہیں ان کی تصنیف "دھنک پر قدم" پر ۱۹۷۰ء میں اعلیٰ ادبی آدم جی ایوارڈ دیا گیا۔ بیگم اختر ریاض الدین نے ادبی خدمات کے ساتھ نمایاں سماجی خدمات بھی انجام دیں۔ اس کے علاوہ آپ کو ۲۰۰۰ء میں سماجی خدمات پر صدرِ پاکستان نے ستارہ امتیاز سے نوازا۔ آپ کو ۲۰۰۵ء میں لائف ٹائم ایچیو ومنٹ ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔

ہ: عطاء الحق قاسمی: اجمالی تعارف

عطاء الحق قاسمی ایک مزاح نگار، شاعر، ڈرامہ نگار، کالم نویس، مدیر، سفارت کار، معلم، سفر نامہ نگار اور خوب صورت دل کے مالک ہیں۔ آپ نے یکم فروری ۱۹۴۳ء کو امر تسر کے ایک مذہبی گھرانے میں جنم لیا۔ آپ کا خاندانی پس منظر حضرت ابو بکر سے جا ملتا ہے۔ آپ کے جد امجد حضرت شیخ محمد بہائی کا شمار کشمیر کے معروف علماء میں ہوتا تھا۔ آپ کے دادا غلام مصطفیٰ نے فقہ و تصوف پر متعدد کتابیں لکھیں۔ آپ کے والد کا اسم گرامی پیرزادہ بہاء الحق قاسمی تھا جو کہ تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہے۔ آپ امامت کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔ آپ کا شمار تحریک پاکستان کے مخلص کارکنوں میں بھی ہوتا تھا۔ قیام پاکستان کے موقع پر آپ کا خاندان امر تسر سے ہجرت کر کے پاکستان آگیا۔ انہوں نے وزیر آباد میں رہائش اختیار کی۔ آپ کی والدہ محترمہ کا اسم گرامی سکینہ بی بی تھا جو کہ دینی اور دنیاوی حوالوں سے معاملہ فہم خاتون تھیں۔ عطاء الحق قاسمی کے ایک بھائی اور چھ بہنیں تھیں۔

آپ کو بچپن میں اپنے گھر کے اندر "شہزادہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آپ کے بچپن کے مشاغل بہت ہی دلچسپ تھے۔ آپ کو پتنگ اُڑانے، اخروٹ کھیلنے، گلی ڈنڈہ، اور پٹھو گرم کھیلنا بہت پسند تھا۔ آپ فٹ بال بھی شوق سے کھیلتے تھے۔ آپ اکثر چھپ کر اکھاڑے میں کُشتیاں بھی دیکھنے جاتے۔ گرمیوں کے موسم میں دریائے چناب کے پانی میں تربوز ٹھنڈے کر کے کھانا بھی اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ سکول جاتے ہوئے دو پیسے خرچ ملتا۔ جن سے آدھی چھٹی کے وقت محمد حسین بلے کی ریڑھی سے آلو چھولے کھاتے تھے۔

آپ نے پرائمری تک تعلیم وزیر آباد سے ہی حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں آپ کا خاندان وزیر آباد سے

لاہور منتقل ہو گیا۔ یہاں آپ نے ماڈل ہائی سکول میں اپنی پڑھائی کو جاری رکھا اور اسی سکول سے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۹ء میں پاس کیا۔ اس کے بعد آپ کے والد کا دل ان کو جامعہ اشرفیہ میں داخل کرانے کا تھا۔ تاہم آپ دنیاوی تعلیم حاصل کرنے پر بضد رہے۔ والدہ اور بہنوں کے اصرار پر آپ کی بات مان لی گئی۔ آپ نے ایف اے ۱۹۶۱ء میں ایم او کالج سے کیا۔ اس دوران علمی و ادبی محفلوں میں شرکت اور شاعروں اور ادیبوں کی صحبت کی وجہ سے لکھنا لکھانا بھی شروع ہو گیا تھا۔ آپ نے ایم اے اُردو پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سید وقار عظیم خاصی شہرت کے حامل تھے۔ دینی تعلیم اپنے والد محترم سے گھر پر ہی حاصل کی۔

ایم اے کرنے کے بعد آپ روزی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ آپ نے بیکری کے کاروبار سے آغاز کیا جو کہ کامیاب نہ ہوا۔ مجید نظامی کے روزنامہ "ندائے ملت" میں بطور سب ایڈیٹر بھی کام کیا۔ یہاں آپ کی تنخواہ ۳۲۳ روپے تھی۔ پھر ۱۹۶۹ء آپ امریکہ چلے گئے۔ وہاں سے سینٹ لوئیس میں بطور ٹیکنیشن کام شروع کیا۔ انڈوں کی فیکٹری میں بطور مزدور ملازمت بھی کی۔ LUMS ریستوران میں نائٹ منیجر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ۱۹۷۱ء میں آپ امریکہ سے واپس وطن لوٹ آئے۔ آپ ایف سی کالج میں بطور پروفیسر بھی رہے۔ یہاں سے آپ نے ۲۰۰۲ء میں ریٹائرمنٹ لے لی۔

آپ کی شادی خواجہ خوشنود علی کی دختر روبی شہناز سے ہوئی۔ روبی شہناز نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا ہوا تھا۔ آپ نے بطور پروفیسر ہوم اکنامکس کالج گلبرگ لاہور میں تدریس کے فرائض دیئے۔ ۲۰۰۵ء کو اسی کالج سے ایسوسی ایٹ پروفیسر کے حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئیں۔ گھر کو چلانے اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں انہوں نے نہایت سلیقہ مندی کا ثبوت دیا اور اپنی ذمہ داری بطریق احسن انجام دی۔ اللہ تعالیٰ نے عطاء الحق قاسمی کو روبی شہناز کے بطن سے تین بیٹے عطا کیے۔ آپ کے بڑے بیٹے کا نام پیرزادہ یاسر قاسمی ہے۔ جو کہ ۱۹۹۶ء میں سی ایس ایس کرنے والے کم عمر ترین امیدوار تھے۔ وہ بطور ڈپٹی کمشنر انکم ٹیکس کی حیثیت سے لاہور میں تعینات رہے۔ آپ روزنامہ جنگ میں "ذراہٹ کے" کے مستقل عنوان سے کالم بھی لکھتے ہیں۔ پیرزادہ عمر قاسمی جو کہ ۱۹۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تاریخ میں ماسٹر کیا ہے۔ سب سے چھوٹے فرزند کا نام محمد علی عثمان قاسمی ہے جو کہ ۱۹۸۰ء میں پیدا ہوئے اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ سے منسلک ہیں۔

۱۹۹۷ء میں آپ کو ناروے میں سفیر بنانے کی پیشکش ہوئی۔ جو کہ آپ نے اپنے خاندان اور دوستوں

سے مشورے کے بعد قبول کر لی۔ آپ نے ناروے میں اپنے قیام کے دوران پاکستان کا امیج نمایاں کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ پاکستان کا تشخص نمایاں کرنے کے ساتھ وہاں پر مقیم تیس ہزار پاکستانیوں کی خوشحالی کے لیے خاطر خواہ اقدامات اٹھائے۔ ۱۹۹۹ء میں آپ کو تھائی لینڈ کا سفیر بنا دیا گیا۔ یہاں بھی آپ نے پاکستان کا قومی تشخص اجاگر کرنے میں نمایاں کام کیا۔ ۱۹۹۹ء میں جب جنرل پرویز مشرف نے اقتدار پر قبضہ کیا۔ تو آپ سفیر کا چارج چھوڑ کر واپس وطن آ گئے۔ آپ کی سفارت کاری کا کل عرصہ ۲۷ ماہ بنتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کو ۲۰۰۸ء میں ان کی خدمات کے صلے میں میں الحمراء آرٹس کونسل کا چیئر مین بنا دیا گیا۔ آپ نے چیئر مین کے حیثیت سے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ پرانے سکرپٹ نکلوا کر ان پر کام شروع کیا۔ جن میں بانو قدسیہ، اشفاق احمد اور کمال احمد رضوی کے ڈرامے نمایاں ہیں۔ آپ نے عارضی ملازمین کو مستقل کرانے کا اہم فریضہ بھی انجام دیا۔ فنکاروں کے لیے مخصوص رقم ۱۰۰۰۰ سے بڑھا کر ۲۵۰۰۰ روپے کی۔ قابل اعتراض ڈرامے جو کہ سٹیج پر پیش کیے جاتے تھے ان کو بند کروا دیا گیا۔ عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد میں آپ کا خصوصی کردار تھا۔

آپ نے اپنی ادبی پہچان زمانہ طالب علمی سے ہی بنالی تھی۔ یونیورسٹی میں طلبہ و طالبات کے ادبی مجلے "محور" کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ جب مجید نظامی نے اپنا اخبار "ندائے ملت" جاری کیا۔ تو آپ نے اس میں بطور سب ایڈیٹر کام بھی کیا۔ آپ چونکہ ادب اور صحافت دونوں شعبوں سے منسلک تھے۔ چنانچہ ان دونوں اصناف کو مختلف طبائع رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے قریب کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر فوزیہ چودھری ان کی صحافتی خدمات کا جائزہ یوں لیا ہے۔

> "اپنی تخلیقی اور اختراعی فطرت کی بنا پر عطاء الحق قاسمی نے صحافت میں ادبی صحافت کا نیا تجربہ کیا۔ خالص صحافتی سطح پر ادب کی اس آبیاری نے بھلے ادب کو کوئی فائدہ نہ بھی پہنچایا ہو لیکن ادبی صحافت کو ایک ایسی بنیاد فراہم کی، جس پر بعد میں اس کی عمارت کھڑی کی گئی۔ گویا اس حوالے دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی ادبی صحافت کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔"(۴۵)

ادارت کے میدان کی ایک نئی جہت اُس وقت سامنے آئی جب آپ نے سراج منیر کی معیت میں ایک منفرد ادبی پرچے "معاصر" کی داغ بیل ڈالی۔ جس کا اہم مقصد اعلیٰ ادبی اقدار کا فروغ تھا۔ معاصر کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ اس میں معروف ادباء اور شعراء کے خصوصی نمبر شائع کیے گئے۔

عطاء الحق قاسمی کا ایک کارنامہ ان کی ڈرامہ نگاری ہے۔ اُن کے مشہور ڈرامے خواجہ اینڈ سن، حویلی اور سارے گامے ہیں۔ جو کہ شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔

آپ کا اصل میدان کالم نگاری ہے۔ آپ مختلف موضوعات پر کالم لکھتے ہیں۔ جن میں وہ معاشرتی، سیاسی، معاشی اور مذہبی مسائل کو اجاگر کیا جاتا ہے اور ان کا مناسب حل بھی بتایا جاتا ہے۔ آپ کا عمدہ اُسلوب عبارت کو مزید خوبصورت بنا دیتا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

> "بطور کالم نگار عطاء الحق قاسمی نے نے اپنی باریک بینی کے بعد سب سے زیادہ کام کاٹ دار اُسلوب سے لیا ہے۔ بلاشبہ وہ صاحب اسلوب قلم کار ہیں۔ ایسا کارگر اسلوب کہ گہری سے گہری بات چند جملوں میں کہہ جاتا ہے اور ایسا موثر اسلوب کہ ہدف بھی مسکرا دے۔"(۴۶)

آپ تیس سال تک "نوائے وقت" کے ساتھ وابستہ رہے۔ ۲۰۰۱ء میں آپ نے جنگ گروپ کو جوائن کر لیا۔ پہلے تیس برسوں میں چھپنے والوں کالموں کو کتابی شکل دی جا چکی ہے۔ جس میں روزنِ دیوار، جرم ظریفی، تجاہل کالمانہ، شر گوشیاں، حبس معمول اور ہنسنا رونا منع ہے، شامل ہیں۔

انھوں کئی اور اصناف ادب میں بھی اپنے فن کا جادو جگایا۔ جس میں خاکہ نگاری بھی شامل ہے۔ جن میں "عطایئے" اور "مزید گنجے فرشتے" اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

آپ نے سفر نامہ نگاری میں خوب نام کمایا۔ اُن کے سفر نامے اُردو ادب میں خاصی شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے اپنی سفر نامہ نگاری میں یورپ کی تہذیب و ثقافت اور رنگینیوں کا بہت عمدہ طریقے سے جائزہ لیا ہے۔ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے عطاء الحق قاسمی کی تعریف یوں کی ہے۔

> "عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں ایک محب وطن پاکستانی اور مزاح نگار ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلتے نظر آتے ہیں۔ مغربی زندگی کی رنگینیوں کو وہ نہ صرف مزے لے کر بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اس استفادے کے رنگ میں بھی زیریں سطح پر ان کی مشرقیت کا عکس رواں دواں نظر آتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتے ہیں مگر اس تماشے کا حصہ نہیں بنتے۔"(۴۷)

آپ کے چار سفر نامے شائع ہو چکے ہیں۔ اَن میں "دلی دور است"، "گوروں کے دیس میں"، "شوق آوارگی" اور "دنیا خوبصورت ہے" شامل ہیں۔ آپ کا ایک سفر نامہ "غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور" بھی ہے۔

جو کہ انہوں نے ایک غیر ملکی کی حیثیت سے تحریر کیا۔

عطاء الحق قاسمی کے سفر نامے ایک محب وطن پاکستانی اور ظرافت نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ وہ مغربی زندگی کی رنگینیوں کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرزِ معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ مغرب کی پر آسائش اور پر رونق زندگی دیکھنے کے باوجود ان کے اندر ایک سچے پاکستانی کی روح نظر آتی ہے۔ محمد کلیم اختر کہتے ہیں۔

> "عطا ایک سچا سُچا اور کھرا پاکستانی ہے۔ خالص پاکستانی فنکار کبھی اپنی پاکستانیت پر سمجھوتا نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ متعدد بار امریکہ، برطانیہ اور بھارت کے دورے کر چکنے کے باوجود وہ کہیں بھی اپنے بعض ہم وطن دانشوروں کی طرح پاکستان سے شاکی نہیں ہوا۔ عطا کے سر میں وطنیت کا سودا ہے۔ تاجرانہ ذہنیت رکھنے والے سیاست دانوں کے نزدیک یہ گھاٹے کا سودا ہے لیکن وہ کملا اسی گھاٹے پر نازاں ہے۔"[۴۸]

عطاء الحق قاسمی کو اُن کی خدمات کی وجہ سے بہت سے اعزازات اور ایوارڈز سے نوازا گیا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں آپ کو آپ کی کتاب "روزنِ دیوار" پہ اعلیٰ ادبی ایوارڈ "آدم جی ایوارڈ" دیا گیا۔ ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۹ء میں آپ کو اے این پی ایس کی طرف سے بہترین کالم نگاری کا ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں ایشین آرٹ سوسائٹی انگلینڈ کا ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۹۹ء میں ستارہءامتیاز سے نوازا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ نفیسہ حق، سفر نامہ، فن اور جواز، (مضمون) مطبوعہ: الذبیر، شمارہ ۵، اردو اکادمی، بہاولپور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۷، ۳۶

۲۔ اردو لغت، جلد پنجم، مرتبہ سعید اے شیخ، رابعہ بک ہاؤس، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۵۱۷

۳۔ Encyclopedia of Britannica, 15th Edition, USA, 1982, Vol:4, P.657 ۱۰ جون ۲۰۱۹ء 4:00 pm

۴۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵

۵۔ حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تہذیب و تحقیق، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۲۰۰

۶۔ سبطِ حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵

۷۔ کرار حسین، پروفیسر، سوالات و خیالات، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲

۸۔ فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، پرنٹنگ پریس محل ناظم آباد، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۹

۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۴۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۱۔ عبد الحفیظ بلیاوی، مولانا، (مترجم)، المنجد، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۹۳

۱۲۔ اردو لغت، جلد پنجم، مرتبہ سعید اے شیخ، رابعہ بک ہاؤس، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۵۴۸

۱۳۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، مضمون "کلچر۔ ایک ارتقاء" مشمولہ کلچر منتخب تنقیدی مضامین، مرتبہ اشتیاق احمد بیت الحکمت، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۷۲، ۱۷۱

۱۴۔ عبد الرحمان منشی، مضمون اسلامی ثقافت کا مسئلہ، مشمولہ "اسلامی تہذیب و ثقافت" مرتبہ ڈاکٹر عطش درانی، شاخ زریں، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۶

۱۵۔ وارث سرہندی، زبان و بیان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۲

۱۶۔ فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، ص ۱۸

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۸۔ محمد سعید، حکیم، افکار و اشخاص، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۳

۱۹۔ عطش درانی، ڈاکٹر، اسلامی فکر و ثقافت، منظور پریس، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۴۷

۲۰۔ نفیسہ حق، سفر نامہ، فن اور جواز، مشمولہ سہ ماہی الذبیر سفر نامہ، بہاولپور، ۱۹۹۸ء، ص ۳۶، ۳۷

۲۱۔ wikipedia.org/wiki/travel_literature ۲۵ جولائی ۲۰۱۹ء، 3:30 pm

۲۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۴۷

۲۳۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴

۲۴۔ خالد محمود، ڈاکٹر، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲

۲۵۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، ادب و فن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۴

۲۶۔ مرزا ادیب، سفر نامہ (مضمون) مطبوعہ: اوراق، شمارہ ۷، دفتر اوراق، لاہور، ۱۹۷۹ء ص ۲۰

۲۷۔ تحسین فراقی، (مقدمہ) عجائبات فرنگ از یوسف خان کمبل پوش، مکہ بکس، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۲۸، ۲۷

۲۸۔ جمیل احمد انجم، پروفیسر، اردو ادب، علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۴۲

۲۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، ص ۲۲۵

۳۰۔ سید احمد خان، سر، مسافران لندن، مرتبہ اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۹۷

۳۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، ص ۱۵۷، ۱۵۶

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۲۶

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۰۴

۳۴۔ مختار الدین، ڈاکٹر، (فلیپ)، آج بھی اس دیس میں، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۱۹۸۳ء

۳۵۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، ص ۴۶

۳۶۔ ایضاً، ص ۶۴

۳۷۔ ایضاً، ص ۶۳

۳۸۔ خالد محمود، ڈاکٹر، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۴۵

۳۹۔ ابوذر عثمانی، اسالیب نثر، پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۷۸ء، ص ۱۷۳

۴۰۔ خالد محمود، ڈاکٹر، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص ۴۵

۴۱۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو سفر ناموں کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۰

۴۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، ص ۲۸۷

۴۳۔ جمیل احمد انجم، ڈاکٹر، اردو ادب، علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۴۵

۴۴۔ صدف فاطمہ، ڈاکٹر، اختر ریاض الدین اور "سات سمندر پار"، (مضمون) مطبوعہ: الماس، شمارہ ۱۸، شاہ عبد اللطیف یونیورسٹی، خیر پور، ۲۰۱۶ء، ص ۸۱۷

۴۵۔ فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، شاداب موسموں کی آواز، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۸۷

۴۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، (دیباچہ) "ڈاکٹر" عطاء الحق قاسمی، غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور، از عطاء الحق قاسمی، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴

۴۷۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، عطاء الحق قاسمی: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۷

۴۸۔ محمد کلیم اختر، چاند چہرے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۵۴

باب دوم:

"دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں" تہذیبی عناصر کی پیشکش

برطانیہ بنیادی طور پر چار انتظامی یونٹوں پر مشتمل ہے۔ جس میں انگلینڈ، شمالی آئرلینڈ، سکاٹ لینڈ اور ویلز شامل ہیں۔ یہ دو جزیروں پر مشتمل ایک خوب صورت ملک ہے۔ برطانیہ آبادی اور رقبے کے لحاظ سے ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ برطانیہ کا کل رقبہ ۲۴۲۴۹۵ مربع کلومیٹر جبکہ آبادی چھ کروڑ سے زائد ہے۔ دولت، طاقت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے برطانیہ ایک مضبوط ملک ہے۔ ایک وقت تھا جب برطانیہ آدھی دنیا پر بادشاہی کرتا تھا۔ اب یہ ایک چھوٹے سے خطے میں محدود ہے۔ اس کا شمار دنیا کی پانچ مضبوط ریاستوں میں ہوتا ہے۔ لندن برطانیہ کا دارالخلافہ ہے۔ یہاں کا ہیتھرو ائرپورٹ دنیا کا ایک مشہور ائرپورٹ ہے۔ اگرچہ انگریزی مشترکہ زبان ہے تاہم کچھ مقامی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ ان میں آئرش، سکاٹش اور ویلش بہت نمایاں ہیں۔ جنگ عظیم دوم ۱۹۳۹ء کے دوران تباہی کے باوجود برطانیہ ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔

لندن کی بنیاد پہلی صدی عیسوی میں رومنوں نے رکھی۔ جب وہ یہاں پر قابض ہوئے تو انہوں نے مشتری، مریخ اور منروا دیوتاؤں کے مندر بنائے۔ جنہیں عیسائیت کی ترویج کے بعد گرجاگھروں میں بدل دیا گیا۔ لندن کا مشہور سینٹ پال کا گرجاگھر اسی کی ایک مثال ہے۔

برطانیہ کی پارلیمنٹ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کو پارلیمان کی ماں بھی کہا جاتا ہے۔ بارہویں صدی تک برطانیہ میں بادشاہت رائج رہی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ شخصی آزادیاں دی گئیں۔ جس کا آغاز ۱۲۱۵ء میں King John کے مشہور معاہدہ میگنا کارٹا سے ہوا۔ مسلسل جدوجہد سے پارلیمانی نظام رائج ہوتا چلا گیا اور آخرکار انیسویں صدی میں جا کر مکمل طور پر پارلیمانی بالادستی حاصل کر لی۔

صنعتی میدان میں برطانیہ نے بہت ترقی کی یہ تمام دنیا سے اونے پونے خام مال خریدتا۔ پھر مختلف قیمتی مصنوعات تیار کر کے دنیا کو مہنگے داموں فروخت کرتا۔ اور یوں صنعت کے شعبے میں لازوال کامیابیاں حاصل کی ہیں اور معاشی طور پر خود کفیل ہو گیا۔

مذہبی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو برطانیہ میں ۷۶ فیصد کیتھولک عیسائی آباد ہیں۔ جبکہ برطانیہ میں بہت زیادہ لامذہب بھی آباد ہیں جو کہ ۸۱ لاکھ ہیں۔ یہاں ۱۵ لاکھ مسلمان بھی بستے ہیں۔ ہندوؤں کی تعداد ساڑھے پانچ لاکھ ہے۔ سکھوں کی تعداد تین لاکھ جبکہ دو لاکھ یہودی بھی یہاں قیام پذیر ہیں۔ مختلف مذاہب کے باوجود

برطانیہ کے شہریوں کو برابر مذہبی آزادی حاصل ہے۔

برطانیہ ایک گنجان آباد ملک ہے۔ ایک میل میں اوسطاً ایک ہزار افراد رہائش پذیر ہیں۔ برطانیہ اور خاص طور پر لندن قدیم اور جدید کا خوبصورت امتزاج ہے۔ انگریز عام طور پر قدامت پرست قوم ہیں۔ یہاں کے لوگ قانون کا حد درجہ احترام کرتے ہیں۔ تحریری دستور نہ ہونے کے باوجود روایات کا پورا پورا احترام کیا جاتا ہے۔ انگریز مزاجاً کھردرے اور مغرور ضرور ہیں لیکن ان کا شمار دنیا کے محنتی اقوام میں بھی ہوتا ہے۔ یہ نظم و ضبط کی پابند قوم ہے اور اس پر خود ساختہ طریقے سے عمل کرتی ہے۔ ہارن کا استعمال زیادہ نہیں کرتے۔ مزاج کے سخت ہونے کے باوجود یہ قوم بس کا انتظار سکون سے کرتی ہے۔ شاپنگ سنٹر ہو یا شراب خانہ یہ ہر جگہ ڈسپلن کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔

الف: "دھنک پر قدم" میں تہذیبی عناصر:

i. سماج کی نظریاتی سطحوں کی پیشکش:

سماج کا لفظ بنیادی طور پر سنسکرت زبان کا ہے۔ اس کے معنی سبھا، مجلس، انجمن، محفل، گروہ، جتھا یا ٹولی۔[۱] کے ہیں۔

سماج کے لیے انگریزی میں لفظ society کا استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں سماج کے مترادف لفظ معاشرہ ہے۔ جس کے لغوی معنی باہم مل جل کر زندگی گزارنا یا اوقات بسری کے ہیں۔

اگر اصطلاحی معنوں میں سماج کا مطلب دیکھیں۔ تو سماج سے مراد طرزِ بود و باش، رسم و رواج، علوم و فنون، اخلاق و عادات، عقائد، افکار و تصورات اور زندگی کے فلسفے کا مربوط نظام ہے۔ جس میں انسان مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ تاہم سماجی نظام کے نفاذ میں کسی قانون ساز ادارے کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ محمد ایوب منیر کہتے ہیں۔

> "معاشرہ افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہوتا ہے جس کی بنیاد مفاد پر ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ معاشرے میں رہنے کی انسان کی خواہش کا سبب اس کی اپنی تمنا و آرزو نہیں، بلکہ ضرورت ہے۔ سماجی رویئے کی بنیاد سماجی سبب نہیں ہوتا، بلکہ اس کی وجہ وہ فوائد ہیں جو اس سے حاصل ہوتے ہیں۔"[۲]

مذہبی نظریے سے انسان کی تخلیق کا جائزہ لیا جائے تو انسان روزِ اول سے اشرف المخلوقات ہے۔ جبکہ

یونانی اور لاطینی مفکرین کے نظریہ ارتقاء کو دیکھا جائے تو انسان کو اس مقام تک پہنچنے میں ان گنت صدیوں کا سفر کرنا پڑا۔ ڈاکٹر سبط حسن کہتے ہیں۔"افریقہ میں انسان کے جو آثار حال میں ہی ملے ہیں ان کے مشاہدے سے اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ بنی آدم کی عمر بیس لاکھ سال سے کم نہیں ہے۔"(۳)

حجری دور میں انسان غاروں میں رہتا تھا اور شکار کے ذریعے اپنا گزر بسر کرتا تھا۔ اس دور میں انسان کا مذہب ritualاور myth کا سنگھم تھا۔ وہ کئی خداؤں کو مانتے اور مذہبی پیشواؤں کی کہانیاں من و عن قبول کر لیتے۔ پھر زراعت کی ایجاد ہوئی۔ مٹی کے سادہ برتن بنائے جانے لگے۔ آہستہ آہستہ انسان بے نظمی کی زندگی چھوڑ کر سماج کے دائرے میں آتا چلا گیا۔

یونان کے بعد روم میں چھٹی صدی قبل مسیح میں عوام نے حکومت میں حصہ لینے کے لیے جدوجہد کی اور اپنے مطالبات منوانے شروع کیے۔ عدل وانصاف اور مساوات پر مبنی سماج کی بنیاد صرف عوام کی خواہش پر نہیں رکھی جاسکتی۔ بلکہ ایک ایسی ریاست کی ضرورت تھی جو لوگوں کی عزت اور جان ومال کے تحفظ کو یقینی بنا سکے۔

یورپ میں ایک طویل عرصہ تک بادشاہت قائم رہی۔ بادشاہ کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ سولہویں صدی میں مغرب میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ اقتدار اعلیٰ بادشاہ سے پارلیمنٹ کو منتقل ہو گیا۔ ضرورت نے تلاش و جستجو کی نئی راہیں کھولیں اور نئی دنیاؤں سے متعارف کرایا۔ جس سماج میں علم کی راہیں کھلتی ہیں۔ وہاں فرسودہ نظام کے بجائے تلاش و جستجو کا جذبہ غالب آتا ہے۔ سائنسی ایجادات سے مغربی سماج نے بہت ترقی کی اور دنیا پر حکمرانی کرنے میں کامیاب ہوا۔ اٹھارویں صدی صنعتی انقلاب کی صدی ثابت ہوئی اور جاگیر دار طبقہ کے بجائے سرمایہ دار طبقہ غالب آنے لگا۔ سفارش حسین رضوی کہتے ہیں۔"ہندوستان کی دولت نے انگلستان پہنچ کر وہاں کی مالی حالت ہی بدل دی اور اقتصادی حالت کو یہاں تک پہنچایا کہ ولایت میں صنعتی انقلاب کا رستہ کھل گیا۔"(۴)

سامراجیت کی وجہ سے برطانیہ دنیا کے ایک بڑے حصے پر قابض رہا اور وہاں کے خام مال اور قدرتی وسائل سے بھرپور استفادہ کیا۔ اہل مغرب سائنسی ترقی کی بنا پر دنیا کے وسائل قدرت پر قابض ہوئے۔ سید علی عباس جلالپوری رقمطراز ہیں۔"سیر حاصل علاقوں پر تصرف حاصل کیا اور اطرافِ عالم سے زرو جواہر سے لدے ہوئے جہاز مغربی ممالک کو جانے لگے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کی مغرب میں صنعتی انقلاب برپا ہوا۔"(۵) طاقت حاصل کرنے کا یہ جنون عالمی جنگوں کا سبب بھی بنا۔ صنعتی انقلاب کے باعث محنت کش طبقے کا استحصال

ہوا۔ جس کی وجہ سے کارل مارکس نے اشتراکی فلسفہ کی بنیاد رکھی اور بہت سے ممالک میں اشتراکی نظام قائم بھی ہوا۔

صنعتی ترقی نے بھرپور مادی وسائل فراہم کیے اور اس مادیت پرستی نے انسان کو دولت کا پجاری بنادیا۔ انسان کی سوچ پر مادیت نے اتنا اثر ڈالا کہ وہ روحانی اور مذہبی اقدار سے دور ہو گیا۔

مرد کے ساتھ ساتھ عورت بھی کسی تہذیب کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ جن کی معاونت کے بغیر ملکی ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ مغرب میں عورت کو سیاسی، معاشی اور سماجی حقوق دلوانے کے لیے کامیاب تحریکیں چلیں۔ جن کی بنیاد پر خواتین اس سماج میں مرد کے برابر حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں اور اب وہ مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ لیکن دوسری طرف اگر اس سماج کا بغور مطالعہ کیا جائے تو حالات اس کے برعکس ہیں۔ حقوق اور آزادی کے نام پر مغربی سماج نے عورت کا بہت زیادہ استحصال بھی کیا ہے۔ عورت کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اہل مغرب نے عورت کو ایک طرف بااعتماد بنایا تو دوسری طرف اس کی تذلیل کی انتہا کردی۔ سفر نامہ نگار کے مشاہدے میں آتا ہے کہ کس طرح عورت کو سماج میں رسوا کیا گیا۔

> "کسی صدی میں بھی عورت کو اتنا ذلیل نہیں کیا گیا جتنا کہ اب۔ پہلے عورت حرم میں ناچی۔ غلاموں کی منڈی میں ناچی لیکن اب ہر صفحے، ہر پردہ سیمیں پر، ہر سٹیج پر اور ہر اشتہار میں عریاں ہے۔ یہ عورت کا سراسر تجارتی و فحاشی استعمال ہے۔"(۶)

بیگم اختر ریاض الدین نے اپنے سفر نامے میں برطانیہ کے نظام سیاست کو بھی عمدہ انداز سے بیان کیا ہے۔ اس ملک میں پارلیمانی جمہویت کا نظام قائم ہے۔ قدیم عرصہ تک بادشاہت کا نظام قائم رہنے کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ اب یہ اختیارات پارلیمنٹ کو منتقل ہو چکے ہیں۔ برطانیہ میں جمہوریت اس قدر مستحکم ہو چکی ہے کہ اب اقوام عالم اس کی تقلید کرتی ہیں۔ تحریری آئین نہ ہونے کے باوجود عوام کی حاکمیت قائم اور حقوق محفوظ ہیں۔ قانون سب کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ شہریوں کو مذہبی، سیاسی، معاشی اور سماجی آزادی حاصل ہے۔ برطانیہ کے نظام حکومت کو جمہوریت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ مصنفہ نے برطانوی سیاسی نظام کی تصویر یوں کھینچی ہے۔ "یہ لندن غیر نوشتہ آئین کا علمبردار۔ یونان کے بعد دنیا کی سب سے پرانی شہری آزادی کی حمایت۔ موجودہ زمانے کی سب سے نیک نیت اور مسلسل جمہوریت!"(۷)

سفر نامہ نگار نے برطانیہ کے دیہی خاندانی نظام کو بھی پیش کیا ہے۔ یہ لوگ سادہ طرز زندگی

بسر کرتے اور پاکستانی دیہاتیوں کی طرح آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ برطانیہ میں کسان اپنے حصے کا کام ذمہ داری اور مکمل ایمانداری سے سرانجام دیتے ہیں۔ یہ لوگ محنت پر یقین رکھتے اور کھیتی باڑی کر کے اپنا گزر بسر کرتے ہیں۔ ان کے گھر صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ مصنفہ ان کی مہمان نوازی سے بہت زیادہ متاثر نظر آئیں۔

مصنفہ نے برطانیہ میں بسنے والے پاکستانیوں، ہندوؤں اور سکھوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ جو بسلسلہ روزگار یہاں آکر مقیم ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنی روایات کو اپنائے ہوئے ہیں۔ سخت محنت کر کے اپنا اور اپنے ملک میں رہنے والے رشتے داروں کا پیٹ پال رہے ہیں۔ مصنفہ کے مشاہدے میں آتا ہے کہ یہ لوگ بہت زیادہ محب وطن اور مہمان نواز ہیں۔

سفر نامہ نگار نے برطانوی سامراجیت کی منظر کشی کی ہے۔ مصنفہ کی یہ خوبی ہے کہ وہ چند جملوں میں پوری تاریخ بیان کر دیتی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ان کا شعور گہرا اور وسیع ہے۔ سفر نامہ نگار کو احساس ہوتا ہے کہ یہ قوم اب بھی اپنے سامراجی عہد پر فخر کرتی ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی بصیرت اور طاقت کے بل بوتے دنیا کے ایک وسیع حصے پر قبضہ کیے رکھا کہ ان کی عظیم سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ تاہم وقت کے ساتھ یہ سامراج بکھر گیا، اب دولت مشترکہ کا روپ دھار چکا ہے اور آہستہ آہستہ ممالک ان سے آزادی حاصل کرتے چلے گئے۔ مصنفہ کہتی ہیں۔

> "تو صاحب کس لندن کی بات کریں؟ سامراجی عہد پر نازاں و درخشاں لندن۔ بین الاقوامی تجارت وضیافت کا مرکز۔ یا پچھلی صدی کا بم زدہ لندن۔ یا اپنی راکھ سے دوبارہ زندہ ہونے والا لندن یا آج کا افراط زدہ لندن۔"(۸)

نشاۃ ثانیہ سے پہلے برطانیہ میں پاپائیت کا راج تھا۔ برطانوی سماج مذہبی لحاظ سے کلیسا کے زیر اثر تھا۔ پاپائیت کا یہ غلبہ ایک لمبے عرصے تک قائم رہنے کے بعد سولہویں صدی میں جا کر اختتام پذیر ہوا۔ اب اگرچہ مذہبی آزادی ہے لیکن مادہ پرستی اور مادر پدر آزادی نے اس سماج کو مذہب سے بیگانہ کر دیا ہے۔ مذہبی رسومات اور عبادات صرف اتوار تک محدود رہ گئی ہیں۔

ii. مذہبی عناصر کی پیشکش:

مذہب ایک ایسا عنصر ہے جس کی وجہ سے انسان کی باطنی اور ظاہری حدود کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ انسان کی اخلاقی تربیت کرنے میں مدد دیتا ہے اور تہذیب کی ترقی اور فروغ میں بھی معاون ہے۔ یہ انسان کے اندر مثبت تبدیلیاں لاتا اور منفی پہلوؤں سے بچاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ یہ انسان کی روحانی تکمیل کرتا

ہے۔ مذہبی تہوار اور سرگرمیاں تہذیب کو پنپنے اور پھیلنے میں مدد بھی فراہم کرتی ہیں۔

بیگم اختر ریاض الدین نے اپنے سفر نامہ "دھنک پر قدم" میں کچھ مذہبی عناصر کی عکاسی کی ہے۔ جن میں اسلام اور عیسائیت نمایاں ہیں۔ برطانوی شہریوں کی اکثریت عیسائی ہے۔ اس کی ۷۶ فیصد آبادی عیسائیت کی پیروکار ہے۔ وہ کلیسا اور پادریوں کے رویوں کی عمدہ طریقے سے عکاسی کرتی ہیں۔ مذہبی عناصر کی پیشکش کرتے ہوئے ہوئے بھی وہ طنز سے کام لیتی ہیں۔ لیکن ان کا طنزیہ لہجہ تکلیف دہ نہیں ہے۔ پادری جو ہر اتوار کو دیہاتی لوگوں کو مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ وہ انہیں ہرگز اچھا نہیں لگتا۔ یعنی عیسائیوں نے اپنی مذہبی عبادات کے لیے صرف اتوار کا دن متعین کر لیا ہے۔ جو کہ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کی مذہب سے بے اعتنائی کو ظاہر کرتا ہے۔ مذہب سے بہت زیادہ دوری کی وجہ سے ان کی تہذیب زوال کا شکار ہو رہی ہے۔ یہ معاشرہ اخلاقی لحاظ سے بے راہ روی کا شکار ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین کے نزدیک دیہاتی لوگ فطرت کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ وہ مکر و فریب کی زندگی سے دور سادہ اور قناعت والی زندگی گزارتے ہیں۔ انہیں اس واعظ یا تبلیغ کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ فطرتی زندگی میں خدا کے بہت قریب ہوتے ہیں۔

> "یہاں ننھے ننھے کلیسا بھی نظر آئے۔ یہ پادری بھی ہر مشکل جگہ مذہبی سرنگ لگا کر پہنچ جاتے ہیں اور سادہ لوح دیہاتیوں، پہاڑیوں کو اتواری واعظ دیتے ہیں۔ میری رائے میں تو یہاں رہنے والوں کو اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ جو جگہ یزدانِ کُل کا عکس ہو جس کے ہر رخ سے خدا داد حسن کی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں وہاں اندھیرے گرجے میں لا کر لوگوں کو کیا بتانا کہ خدا بھی ہے؟"(۹)

سینٹ پال گرجاگھر جو کہ عیسائیت کے فروغ میں معاونت کر رہا ہے۔ یہ لندن میں واقع ہے۔ سینٹ پال نے جو نظریات پیش کیے وہ اب تہذیب میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس نے عیسائیت میں بہت سی ترمیم کیں۔ یہ ترامیم اب اس مذہب کا لازمی جزو بن چکی ہیں۔ اس مذہب کے ماننے والے سینٹ پال کے نظریات کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہے۔ اختر ریاض الدین نے اپنے سفر نامے "دھنک پر قدم" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ "سینٹ پال کا گرجاگھر جو سرِراہ مصوروں کے لیے زیادہ مشہور ہے۔"(۱۰)

دوسری طرف یورپ میں تارکین وطن نے چیلنج کھڑا کیا ہوا ہے۔ یہاں ہجرت کر کے آنے والے دوسری تہذیبوں کے لوگ ان معاشروں میں ضم نہیں ہو پا رہے۔ وہ اپنی اقدار، رسوم و رواج اور ثقافت سے وابستہ ہیں۔ یورپ میں بسنے والے مسلمان اس کی مثال ہیں۔ برطانیہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد قیام پذیر

ہے۔ ان میں سے اکثریت وہاں کی مستقل شہریت اختیار کر چکی ہے۔ جبکہ بہت سے بسلسلہ روزگار وہاں مقیم ہیں۔ بیگم اختر ریاض الدین چونکہ خود بھی مسلمان ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کے تہواروں اور سرگرمیوں کا اچھی طرح سے احاطہ کیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے مذہبی تہواروں کی عمدہ طریقے سے عکاسی کی ہے۔ مذہبی تہوار منانااور خوشیوں کو بانٹنا مسلم تہذیب کا لازمی جزو ہے۔ قربانی اور ایثار کا جذبہ مسلمانوں میں بدرجہ اتم ہوتا ہے۔ اسی جذبے سے سرشار ہو کر وہ ہر وقت اور ہر جگہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے وہ یہ مذہبی تہوار پاکستان میں منا رہی ہیں۔ مغربی تہذیب کے اندر رہتے ہوئے بھی برطانیہ کے مسلمان پورے جوش وخروش اور اہتمام کے ساتھ مذہبی تہوار مناتے ہیں۔ اختر ریاض الدین نے برطانیہ میں بقرعید کے تہوار کی عکاسی اس طرح کی ہے۔

> "صبح بقر عید تھی ہم سب نے نہا دھو کر نماز پڑھی۔ ایک دوسرے کو گلے ملے۔ زرِمبادلہ میں کم بخت عیدی دی۔ سب سے زیادہ چٹی راجہ صاحب پر پڑی کہ ہم سب اُن کے چھوٹے تھے۔ ہماری مہربان میزبان نے ناشتے پر چھ قسم کے جیم۔ جیلی (سب خالص گھر کے بنے ہوئے) شہد۔ مکھن۔ کرارے ٹوسٹ۔ دودھ انڈے۔ کیک۔ چائے۔ پھل سجادیے۔ میز بھر گئی مگر ہماری نیت نہیں بھری۔"(۱۱)

صدقات اور خیرات میں دنیا بھر میں مسلمانوں کا کوئی ثانی نہیں۔ دنیا میں کہیں بھی آفت یا مصیبت آ جائے تو یہ دل کھول کر اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ لندن کے مسلمان اپنے وطن سے دور رہتے ہوئے اپنے وطن سے شدید محبت اور لگاؤ رکھتے ہیں اور ہر مشکل گھڑی میں اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔

> "لندن کے مسلمانوں نے حسین دریا دلی سے چندہ دیا اور جن جذبات کا اظہار کیا۔ وہ ناقابل فراموش ہے۔ طلبا کا بس چلتا تھا کہ اپنے تعلیمی پنجروں کو توڑ کر اپنی سرزمین پر پہنچیں۔ شیروں کی طرح ٹہلتے اور غراتے تھے لیکن بے بس تھے۔ مسلمان ہوٹل والوں نے اپنی حُب الوطنی کا ثبوت طعامی قسم کا دیا۔"(۱۲)

برطانیہ میں ہر شہری کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر نہ صرف مذہبی رسومات ادا کر سکتے ہیں۔ بلکہ اپنی رائے کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ یہاں ہر ملک کے ہر مذہب کے لوگ رہتے ہیں۔ یہاں دہریے بھی ہیں اور میتھڈسٹ بھی۔ مذہبی آزادی اس قدر حاصل ہے کہ وہ مذہب پر سرعام گفتگو اور تنقید کرتے ہیں۔

ان کی مذہبی آزادی پر بات کرتے ہوئے اختر ریاض الدین کہتی ہیں۔

"ہائیڈ پارک میں اگر اتوار کو ٹہلنے نکلتے تو جگہ جگہ بھانت بھانت کے مقرر تقریر کر رہے تھے۔۔۔۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے۔ "حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود کنوارے تھے اور کہتے تھے کہ صرف ۴۵ کنوارے جنت میں جائیں گے۔ اس لیے صاحبان شادی نہ کریں۔ "دوسری للکار آئی۔ "کل سینٹ پال گرجا سے مذہب کا جنازہ نکلے گا۔ آپ خود شرکت نہ کر سکیں تو کم سے کم ٹیلی ویژن پر اس کی آخری شکل ضرور دیکھ لیں۔"(۱۳)

مذہب کسی بھی تہذیب کا ایک اہم جزو ہے۔ تہذیب کو فروغ دینے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ مسلمان مغربی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اپنی مذہبی مقامات اور عبادات کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اختر ریاض الدین نے اپنے سفرنامے میں مسلمانوں کی مذہبی عبادت گاہوں کی منظر کشی منفرد انداز سے کی ہے۔ وہ خوب صورت طنز کے ذریعے بعض تلخ حقائق سے آگاہی بھی فراہم کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک خدا وہیں ملے گا جہاں غربت ہو گی۔ وہ یہ وضاحت بھی کرتی ہیں کہ مساجد عبادت کے ساتھ ساتھ مذہب اور اخلاقیات کے فروغ میں مدد فراہم کرتی ہیں۔ چنانچہ مذہب اور مذہبی مقامات سے شدید لگاؤ مسلم تہذیب کا جزو لانیفک ہے۔

"اس کے بعد روحانی غذا کا بھی ذکر ہو جائے۔ یہاں تین مسجدیں ہیں۔ ایک "ایسٹ اینڈ" میں جو غریبوں کا علاقہ ہے (خدا اور کہاں بسے گا؟) دوسری "ووکنگ" میں ' تیسری مسجد "بیکر سٹریٹ" میں۔ غریبوں کی مسجد میں جنرل حق نواز اور میرے میاں کبھی کبھی وعظ کرنے جاتے تھے اور اسلامی تبلیغی مشن کو اخلاقی مدد بہم پہنچاتے تھے۔"(۱۴)

مغربی معاشرہ بے راہ روی اور لادینیت کی وجہ سے زوال پذیر ہے۔ یہ لوگ اپنے مذہب سے بے زار ہو چکے ہیں۔ وہ عریانیت اور اپنی بے مقصد زندگی سے تنگ آ چکے ہیں۔ وہ اسلامی تعلیمات میں امن اور سکون محسوس کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام یورپ کے اندر تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مختلف مذاہب کے پیروکار اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ اسلامی تعلیمات حاصل کرنے اور عبادت کے لیے مساجد کا رخ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ برطانیہ میں مکمل مذہبی آزادی ہے۔ کوئی شخص بھی اپنی پسند کا مذہب اختیار کر سکتا ہے اور اپنی مذہبی عبادات بجا لا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کر سکتا

ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین کہتی ہیں۔

"عید پر مسجدوں میں سڑک تک نمازی اُبل رہے تھے۔ کچھ پاکستانی اپنی انگریز بیویوں کو تماشہ دکھانے لائے تھے۔ کچھ سیاہ حبشنیں نیم عریاں فراکوں میں سجدے یا رکوع میں تھیں۔ کئی فرنگی تھے جو نئے نئے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔"(۱۵)

سفر نامہ نگار نے مغربی تہذیب کے اس اہم عنصر کا گہرائی سے مشاہدہ کیا۔ مسیحی اکثریت والا یہ معاشرہ اپنی مذہبی اقدار سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ صنعتی ترقی نے اسے مادہ پرست معاشرہ بنا دیا ہے۔ تاہم یہاں مذہبی آزادی ہے ہر شخص اپنی مرضی کا مذہب اختیار کر سکتا اور عبادات بجا لا سکتا ہے۔

iii. نسلی، لسانی اور تاریخی عناصر کی پیشکش:

نسلی عناصر:

برطانیہ کی آبادی چھ کروڑ سے زائد ہے۔ یہاں بہت سی نسلوں اور ملکوں کے لوگ رہائش پذیر ہیں۔ برطانیہ کے اپنے شہری بھی مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں انگریز، آئرش، ویلش اور سکاٹش قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پاکستانی، ہندوستانی، بنگالی، جمیکن، کیوبن اور دوسری بہت سی نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ دولت، طاقت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے برطانیہ کا شمار مضبوط ممالک میں ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں یہ ملک ترقی و خوشحالی کی علامت ہے۔ کوئی شعبہ ہائے زندگی ایسا نہیں کہ جس میں دیگر ممالک خاص طور پر مشرقی ممالک اس کی تقلید کرنا اپنے لیے باعث فخر نہ سمجھتے ہوں۔ اس کی شان و شوکت والی زندگی دنیا کے لیے باعث رشک ہے۔ چنانچہ یہاں مختلف ملکوں کے لوگ تعلیم، ملازمت اور سیر و سیاحت کے لیے آتے ہیں۔

برطانوی شہری اپنی روایات سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ تاہم یہ لوگ قدامت پرست بھی ہیں۔ یہ اپنی روایات کو مٹنے نہیں دیتے۔ انہوں نے ابھی تک بادشاہت کو کسی نہ کسی صورت قائم رکھا ہوا ہے۔ یہ اپنی ملکہ کا حد درجہ احترام کرتے ہیں۔ اپنی روایات سے والہانہ لگاؤ ان کی تہذیب کا حصہ بن چکا ہے۔ دوسری طرف یہ قوم سلیقے اور آداب کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔

"اتنے میں بینڈ بجا اور ملکہ کی آمد کے لیے چوبداروں نے راستے بنانے شروع کئے۔ مہمان پلے پڑ رہے تھے زیارت کے لیے' محل کے ڈپٹی نے ان کو ہٹا ہٹا کر قطاریں لگوائیں۔ تا کہ ملکہ ہر ایک کو ذرا ذرا مسکراہٹ بانٹ سکے۔ ہاتھ ملانا تو ناممکن بات تھی۔"(۱۶)

دنیا کی محنتی اقوام میں انگریز قوم کا شمار بھی ہوتا ہے۔ اسی محنت کی بدولت انہوں نے بہت ترقی کی ہے۔ یہ کوئی کام کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ یہاں کے دیہاتی مہمان نوازی میں خاصی شہرت کے حامل ہیں۔ یہ نہایت اچھے اخلاق کے مالک اور سادہ زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ پھر اس قوم نے نفاست اور صفائی پر اتنازور دیا کہ نفاست مغربی تہذیب کا حصہ بن چکی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی نفاست کی مثالیں دنیا دیتی ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین کہتی ہیں۔

"ہم نے اس تمام سفر میں ایک عہد کیا کہ ہوٹل میں ہرگز نہیں ٹھہریں گے۔ چاہے کتنا سستا ہو۔ اس علاقے کے لوگ بہت مہمان نواز اور خلیق و سادہ سچے انسان ہیں۔۔۔۔۔ یہ ایک صاحب جائداد کسان کا "کوٹیج" تھا۔ جس کے ارد گرد اس کے کھیت اور ننھے باغیچے تھے۔ مالکن ایک موٹی، مشفق اور معمر عورت تھی۔"(١٧)

برطانیہ کے لوگ محنتی ہونے کے ساتھ علوم و فنون میں بھی آگے ہیں۔ دراصل ان کی کامیابی کا راز علمی میدان میں نمایاں ترقی ہے۔ انہوں نے علم و ہنر حاصل کر کے دنیا کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ یہاں کے پروفیسر اور لیڈر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ علم سے محبت ان کی تہذیب میں رچ بس گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ممالک سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد یہاں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں علم اور تربیت کے لیے آتی ہے۔ پھر مغربی تہذیب میں رہنے سے وہ ان کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ مغربی تہذیب ان کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔

"اس سارے قیام کا ہیرو تو ڈیفنس کالج ہی تھا۔ اگر دنیا میں کوئی بہترین کورس ہے تو "آئی ڈی سی" افسوس کہ یہ دوبارہ نہیں ملتا۔ یورپ کے بہترین دماغوں۔ انگلستان کے مشہور لیڈروں۔ پرفیسروں۔ صحافیوں کو باری باری تقاریر اور مباحثے کے لیے مدعو کرتے ہیں۔ ہر بدھ کو چائے پارٹی پر بیویاں بھی بلائی جاتی ہیں اور پھر چُنے چُنے فلم دکھائے جاتے ہیں۔ مہینہ میں ایک "ڈنر اور ڈانس" بھی ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ امریکہ اور دولت مشترکہ کے دلچسپ لوگوں سے مل کر ذہنی فراخی ملتی ہے۔"(١٨)

انگریز قوم یہاں دوسری اخلاقی برائیوں کا شکار ہے وہیں جوئے کی لعنت بھی ان میں رچ بس گئی ہے۔ جس سے ان کی سماجی تہذیب مسائل کا شکار ہے۔ یہ بھی ان کی تہذیب کا ایک تاریک پہلو ہے۔ "انگریز قوم بھی جوئے کی بڑی دھتیا ہے۔ کچھ نہیں تو کتوں پر ہی شرط لگا دیتی ہے۔"(١٩)

برطانیہ میں بنگالی بھی ایک بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ جو کہ مسلسل محنت اور جدوجہد سے برطانوی سماج کے اندر نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ بہت زیادہ مہمان نواز ہیں۔ چونکہ مہمان نوازی مسلم تہذیب کا خاصا ہے اور یہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو رہی ہے۔ مغربی تہذیب میں رہتے ہوئے بھی ان کے گھر کا نظام اور ان کی اپنی مسلم تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہاں عورت گھر کا نظام چلاتی اور شوہر کے ذمہ اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھنا ہے۔

> "ہمارے فلیٹ کی مالکن رما ایک قابل ہنر بنگالن تھی جس نے "بالشٹری" پاس کر لی تھی۔ اس کا پنجابی میاں ایک سیلانی تاجر تھا جو دنیا گھومتا اور شاذونادر گھر آتا تھا۔ رما دل کی اچھی اور دماغ کی اس سے بھی اچھی۔ جب بھی کوئی ڈش پکاتی تو ہم کو ضرور کھلاتی۔"[۲۰]

برطانیہ میں ہندوستان کے شہری بھی مقیم ہیں۔ جن کے آباؤاجداد ایک طویل عرصے سے یہاں رہے اور انہوں نے اپنی تہذیب اور روایات کو برقرار رکھا۔ مغربی تہذیب میں رہتے ہوئے بھی اپنی اقدار کو نہ چھوڑا۔ انہوں نے خوب محنت مشقت سے ترقی کی اور نام کمایا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ اپنی روایات کو بھولتے چلے گئے اور مغربی تہذیب کے گرویدہ بن گئے۔

> "کیا پرانے وقت ہوں گے جب راجہ مہاراجہ لندن میں آکر اس دھج سے رہتے تھے، جو بھی سہی اس عہد رفتہ میں ایک رنگینی تھی۔ ایک وضعداری تھی۔ اس کے فراغ سایوں میں ہزاروں فن کاروں، نائکوں اور دستکاروں نے برطانوی بے اعتنائی سے بچ کے پناہ لی۔ روزی اور تشفی پائی۔ افسوس راجہ صاحب تو مٹ گئے، لیکن ان کی جگہ نئے ساہوکاروں نے صرف دولت کمائی مگر اس کا صحیح مصرف نہ جانا۔"[۲۱]

سکھ نسل کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ دنیا کے جس حصے میں بھی نظر آئیں۔ آپ ان کو دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔ یہ اپنی تہذیب سے بندھے ہوئے ہیں۔ اپنی خاص پہچان اور خلوص سے یہ آپ کو گرویدہ بنا لیں گے۔ یہ لوگ مغربی رنگارنگی تہذیب کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنی اقدار کی حفاظت کیے ہوئے ہیں۔ یہ وہاں بھی آپ کو داڑھی اور اپنی مخصوص پگ پہنے نظر آئیں گے۔ بیگم اختر ریاض الدین نے اپنے سفرنامے میں کہتی ہیں۔

> "سامنے کونے پر جو نظر پڑی تو ایک سکھا شاہی پگ چوڑیاں پیچ رہی ہے۔ آواز آئی۔

بھین جی آپ کو ضرور پہنانی ہیں۔ یارب یہ سکھ اس علاقے میں بھی اپنی "دہی آلود"
ڈاڑھیاں لے کر پہنچے ہوئے ہیں۔ ان سے کہاں مفر ہو گا۔"[۲۲]

برطانیہ میں پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد رہتی ہے۔ جب کہ کچھ وہاں روز گار کے لیے گئے پھر وہاں کی مستقل شہریت اختیار کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں خاندان کے خاندان آباد ہو گئے۔ انہوں نے اپنی محنت کی بدولت یہاں اثرورسوخ بھی حاصل کر لیا۔ کئی پاکستانی نژاد لوگ دارلعوام کے رکن بھی منتخب ہو گئے۔ یہ نہ صرف برطانیہ کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں بلکہ پاکستان میں مقیم اپنے اہل و عیال کی مالی مدد بھی کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار نے برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی کثرت کا ذکر دلچسپ انداز سے کیا۔ "لندن میں چند خوبیاں ہیں لیکن ایک یہ زبردست کمی ہے کہ وہاں ہم وطن بہت نظر آتے ہیں اور نظر آنا بھی برا نہیں۔"[۲۳]

برطانوی معاشرے کی خوبصورتی ہے کہ مختلف ممالک کے لوگ یہاں رہائش پذیر ہیں اور اس کر ترقی وخوشحالی میں اپنا کردار نبھا رہے ہیں۔ برطانیہ کا شمار نہ صرف ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے بلکہ شہری آزادیوں کی وجہ سے یہ اپنی مثال آپ ہے۔ اگرچہ یہاں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں تاہم یہ معاشرہ مجموعی طور پر نسلی تعصب کا شکار نہیں ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین نے اس معاشرے کے زیادہ تر مثبت پہلوؤں کو ہی بیان کیا ہے۔

لسانی عناصر:

برطانیہ میں انگریزی مشترک زبان ہے جو کہ ایک بین الاقوامی زبان کا درجہ پا چکی ہے۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جہاں انگریزی زبان بولی اور پڑھائی نہ جاتی ہو۔ انگریزی مشترک زبان ہونے کے باوجود یہاں مختلف علاقوں کے لوگ اپنے علاقے کی بولی بولنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ جس طرح پاکستان میں اردو کے ساتھ پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اسی طرح برطانیہ میں بھی انگریزی کے علاوہ سکاٹش جسے Gaelic بھی کہتے ہیں، ویلش اور آئرش بولی جاتی ہیں۔ تاہم ان علاقائی زبانوں میں انگریزی کے الفاظ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ، ویلز اور آئرلینڈ کے شہریوں کی اکثریت انگریزی کے مشکل الفاظ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ آج انگریزی رابطے اور ٹیکنالوجی کی زبان بن چکی ہے۔ بہت سے لوگ مادری زبان نہ ہونے کے باوجود بھی انگریزی زبان بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ جس سے اس کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

بیگم اختر ریاض الدین کے سفرنامے میں ہمیں برطانیہ میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کے بارے

آگاہی ہوتی ہے۔ ان کو خود بھی انگریزی زبان پر زبردست عبور حاصل تھا۔ برطانیہ کے لوگوں کو یہاں اپنے رنگ اور نسل پر غرور ہے وہیں وہاں وہ اپنی زبان پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ وہ دنیا بھر میں اپنی زبان کو متعارف کرانے میں کوشاں ہیں۔ انگریزی زبان نے ان کی تہذیب کو مقبول بنا دیا ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ انگریزی زبان ان کی تہذیب کا لازمی عنصر بن چکی ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین کہتی ہیں۔

"جب اس کی آرٹ گیلریوں اور عجائب خانوں میں گھنٹوں قدامت سے متعارف ہوتے ہیں۔ اس کے پروفیسروں اور دانشوروں سے ہم کلام ہوتے ہیں تو ایک ایسا لطف آتا ہے جو اور کہیں نہیں۔ شاید زبان فہمی اس کی وجہ ہو لیکن امریکہ میں بھی تو انگریزی ہے۔"(۲۴)

اپنی زبان کو فروغ دینے کے لیے برطانوی حکومت نے بہت سے اقدامات کیے۔ اس حوالے سے لاتعداد کتب خانے قائم کیے گئے ہیں۔ یہ کتب خانے ایک طرف لوگوں کی علمی پیاس کو بجھاتے ہیں تو دوسری طرف انگریزی ادب کو فروغ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بی بی سی لندن نے معیاری زبان کی اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔ آزاد صحافت کے ساتھ اس نے انگریزی زبان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ بی بی سی لندن ایک تہذیبی ورثہ بن چکا ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین اس حوالے سے کہتی ہیں۔

"اعلیٰ تھیٹر اور اعلیٰ کُتب خانوں کا آخری معیار! آزاد صحافت اور شائستہ بی۔بی۔سی کا لندن! "لیبر" حکومت کے اصولوں کا نیلام لندن۔ قلم رکتا نہیں۔ جذبات تھمتے نہیں۔ اگر کبھی جلا وطن ہوئی تو بسوں گی لندن میں۔ ہاتھی مر کے بھی سوا لاکھ ٹکے کا ہے۔"(۲۵)

انگریزی زبان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا میں شاید ہی ایسا ملک ہو یہاں انگریزی ادب نہ پڑھایا جاتا ہو۔ بلکہ فلموں اور ڈراموں کے ذریعے سکرین کے پردے پر دکھایا بھی جاتا ہے۔ اسی بنا پر آج مغربی تہذیب نے اقوام دنیا کو محو حیرت میں ڈالا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ تھیٹر اور رقص مغربی تہذیب کا حصہ بن چکے ہیں۔ بیگم اختر ریاض الدین کہتی ہیں۔

"ہر بدھ کو چائے پارٹی پر بیویاں بھی بلائی جاتی ہیں اور پھر چنے چنے فلم دکھائے جاتے ہیں۔ مہینہ میں ایک "کاک ٹیل" "ڈنر اور ڈانس" بھی ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ امریکہ اور دولت مشترکہ کے دلچسپ لوگوں سے مل کر ذہنی فراخی ملتی ہے۔"(۲۶)

انگریزی زبان کے فروغ میں انگریز ادیبوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس حوالے سے شیکسپیئر ااور ورڈز ورتھ کا نام کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ ان کا لکھا ہوا ادب مغربی تہذیب کا خاصا بن چکا ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین اس حوالے سے کہتی ہیں۔

"ایک سادی شام "سرجون گیل گوڈ" کے ساتھ گزاری۔ شیکسپیئر کے مختلف المیہ۔
مزاحیہ تاریخی ڈراموں اور نظموں کو اس شخصیت نے تین گھنٹے سٹیج پر تن تنہا پیش کیا۔
ہر دفعہ مختلف انداز میں مختلف کرداروں کی جس طرح شیکسپیئر نے صفحہ پر تشکیل دیا۔
یہ محض آواز اور ادائیگی سے پیش کرتا تھا۔"(۲۷)

یہاں برطانیہ کے لوگوں کو اپنی زبان پر غرور ہے، وہیں ان کی فلمیں اور ڈرامے عریانیت اور طوائفی جملوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جو کہ ان کی تہذیب پر منفی اثرات ڈالتے ہیں۔ ان کے سٹیج ڈراموں میں عریانیت اور طوائف بازاری دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس قوم نے آزادی کے پہلو کا منفی طریقے سے استعمال کیا ہے۔ یہ آزادی کی آڑ میں بے راہ روی کا شکار ہو گئے۔ فیشن کے نام پر صنف نازک کا استحصال کر رہے ہیں۔ انہی وجوہات کی بنا پر مغرب کا سماجی نظام زوال کا شکار ہے۔

"یہ عجیب بات ہے کہ انگلستان فلموں پر زبردست اخلاقی پابندیاں عائد کی گئی ہیں لیکن
تھیٹر کو "سینسر" اور "لارڈ چیمبر لین" نے کھلی آزادی دے دی رکھی ہے۔ نتیجہ یہ ہے
کہ کوئی عریانی ایسی نہیں جو سلیقے سے سٹیج پر پیش نہ ہو سکے۔"(۲۸)

دوسرے ممالک سے برطانیہ میں آبسنے والے لوگ کچھ ہی عرصہ میں انگریزی زبان پر عبور حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کے بچے بھی روانی سے انگریزی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بچے اتنی روانی سے انگریزی بولتے ہیں کہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ ان کی مادری زبان ہے۔ زبان کے فروغ سے برطانیہ کی تہذیب بھی دوسرے ممالک پر اپنے اثرات مرتب کر رہی ہے۔ آج کے والدین اپنے بچوں کو انگریزی زبان سکھانے کے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اس بات پر فخر ہے کہ ان کے بچے انگریزی زبان پر زبردست عبور رکھتے ہیں۔ "ہمارے فلیٹ کی مالکن رما ایک بنگالن تھی جس نے بالشٹری پاس کر لی تھی۔۔۔ اس کی چھوٹی تین سالہ بیٹی "گوری" بہت مزے کی زبان انگریزی میں ملا کر بولتی تھی۔"(۲۹)

سکھوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنی زبان اور اقدار و روایات کو فوقیت دیتے ہیں۔ جب کوئی انہیں پنجابی سمجھنے والا نظر آئے تو وہ ٹھوس پنجابی میں بات کرتے ہیں۔ پنجابی زبان ان کی تہذیب کا نمایاں پہلو ہے۔ وہ

پنجابی زبان کے شائستہ جملے نہایت ہی نفیس انداز سے بولتے ہیں جن میں زبردست مٹھاس اور خلوص ہوتا ہے۔ وہ اپنے پرخلوص جملوں سے دوسروں کو اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں۔

برطانیہ میں رہائش پذیر پاکستانی آپس میں اکثر اردو زبان بولتے ہیں۔ "دھنک پر قدم" میں بیگم اختر ریاض الدین کئی مقامات پر اپنے ہم وطنوں کے ساتھ اردو کے مختصر اور دلچسپ مکالمے بولتی نظر آتی ہیں۔

> "ناصر ساری رات بھینس کی زچگی میں ساتھ دے چکا تھا۔ صبح بھنایا ہوا تھا۔ جب کار چلی تو کچھ دور جا کر بولا۔ "اختر آپا۔ آج بقر عید ہے اور خاص اس موقع پر اس سارے فرنگی فریب میں ایک مسلمان نہیں جو قربانی دے۔ اس ننھی سی جھیل پر کار روک کر ذبح کر دوں۔"
>
> میں نے کہا۔ "کسے"
>
> بولا۔ "بھینس کے بچے کو"(۳۰)

انگریزی ایک آفاقی زبان کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ اس کی مقبولیت کا اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ زبان ہر ملک میں بولی اور پڑھائی جاتی ہے۔ دوسرے ممالک کے شہری بھی اپنے بچوں کو انگریزی زبان سکھانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ انگریزی کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں کچھ دوسری زبانوں نے بھی فروغ پایا ہے جس میں سے ایک اردو بھی ہے۔

تاریخی عناصر:

سفر نامہ میں کسی ملک یا قوم کی ادبی، تاریخی اور تہذیبی زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ بنی آدم کی تہذیب و ثقافت کی تاریخ سفر نامہ کے ذریعے بھی دنیا کے دوسرے خطوں میں منتقل ہوتی ہے۔ تاریخ کی کتب میں واقعات کو ترتیب کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ایک مورخ سنہ یا واقعہ ہی بیان کرتا ہے۔ جبکہ سفر نامہ نگار پورے حقائق کو سیاق وسباق کے ساتھ تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر مورخ واقعات کے بیان کے وقت جذبات سے کام نہیں لیتا جبکہ سفر نامہ نگار تاریخ کو جذبات و احساسات کے ساتھ قلمبند کرتا ہے۔ اس چیز کا خدشہ ہوتا ہے کہ مورخ کسی بات کو چھپا دے لیکن سیاح عام طور پر ایسا نہیں کرتا۔ اس طرح ہمیں سفر ناموں سے کسی ملک کی تاریخ کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے اس کو یوں بیان کیا ہے۔

> "سفر ناموں کی تاریخی اور سماجی اہمیت مسلم ہے، سفر ناموں سے بہت سے ایسے

واقعات اور حادثات کا پتہ چلتا ہے جو عام تاریخی کتابوں میں نایاب ہیں، تاریخ نہ ہوتے ہوئے بھی سبھی سفر نامے ہمارے لیے تاریخ کا ایسا مواد پیش کرتے ہیں جو بذات خود ایک تاریخ بن جاتے ہیں۔ اپنے زمانے کے حالات وواقعات اور تہذیب و معاشرت کو ایک سیاح اپنے نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے۔"(۳۱)

سفر نامہ میں بہت سے تاریخی واقعات سے آگاہی ہوتی ہے جو کہ بعض اوقات تاریخ کی کتب میں بھی نہیں ملتے۔ سفر نامہ اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ بھی ہوتا ہے۔ جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کسی خاص عہد میں کسی خاص علاقے کے رسم ورواج کیا تھے۔ ان کی زبان اور مذہب سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انقلاب سے وہاں کی سیاسی اور سماجی تہذیب شدید متاثر ہوتی ہے۔ یہ سارے تاریخی واقعات اور تبدیلیاں سفر ناموں میں مل جاتی ہیں۔ مختصراً سفر نامے نہ صرف ایک عہد کی تہذیبی زندگی کو محفوظ کرتے ہیں بلکہ اس تہذیب کو آگے منتقل کرنے کا ذریعہ بھی ہیں۔

بیگم اختر ریاض الدین کے سفر ناموں میں تاریخی واقعات تواتر سے ملتے ہیں۔ اگر ان تاریخی واقعات کو ان کے سفر ناموں سے الگ کیا جائے تو ان کے سفر ناموں کی روح ہی ختم ہو جائے۔ مصنفہ اپنے سفر ناموں میں اختصار کے ساتھ پورا عہد اور تاریخ بیان کر دیتی ہیں۔ ان کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر گہری نظر ہوتی ہے۔ وہ غیر جانبداری سے حالات وواقعات کو دیکھتی اور پرکھتی ہیں۔ ان کا تاریخی شعور پختہ اور مطالعہ وسیع ہے۔ ان کا صحافتی تجربہ بھی حقائق کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ ان کی حال اور ماضی پر گرفت ہے۔ تاریخ سے دلچسپی مصنفہ کی فطری میلان کی وجہ سے زیادہ ہے۔ آپ نے تاریخی حقائق کی وضاحت غیر جانبداری سے کی ہے۔ جو کہ دلچسپ ہونے کے ساتھ معلومات کا ذریعہ بھی ہیں اور مستقبل کے لکھاریوں کے لیے رہنمائی کا کام بھی دیتے ہیں۔ تاریخ کو بیان کرتے ہوئے بھی آپ کی تحریروں میں طنز و مزاح کا دلفریب امتزاج بھی ملتا ہے۔

بیگم اختر ریاض الدین نے اپنے سفر نامے "دھنک پر قدم" میں برطانیہ کے کئی تاریخی عناصر کو پیش کیا ہے۔ وہ لیک ڈسٹرکٹ سے بہت متاثر نظر آتی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ اس علاقے کی خوبصورتی ہے۔ جس کی وجہ سے شعراء نے بہت سی عمدہ نظمیں تخلیق کر لیں۔ اس کے قدرتی حسن کی وجہ سے ادیب نئی نئی تشبیہات اخذ کر لیتے ہیں۔ فطرت کے اس حسن میں تخلیق کیا گیا ادب مغربی تہذیب کا حصہ بن گیا۔ فطرت کی خوبصورتی نے انگریز قوم کو نفاست پسند بنا دیا۔

وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

"میں "لیک ڈسٹرکٹ" کالج میں اکثر انگریزی پڑھاتے ہوئے سوچتی تھی کہ یا اللہ یہ "جھیلوں کا ضلع" کیا شے ہو گی جس نے ہر شاعر کے کلام کو نئی ترنگ دی۔ ہر ادیب کو نئی تشبیہات دیں۔ جس کا حسن خالقِ کائنات کی محبوب صناعی کہا جاتا ہے۔"[۳۲]

لیک ڈسٹرکٹ ۹۱۲ مربع میل پر محیط ہے جو کہ برطانیہ کے علاقہ Cumbria میں واقع ہے۔ اس میں ہر سال دنیا بھر سے ۱۶ ملین سیاح سیر کے لیے آتے ہیں۔ Scafell Pike کا پہاڑ جو برطانیہ کا سب سے بلند پہاڑ ہے، اسی علاقے میں واقع ہے۔ یہ جھیل گہری اور قدرتی لمبی ہے۔ لیک ڈسٹرکٹ کی وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ برطانیہ کے مشہور شاعر ولیم ورڈز ورتھ کا گھر Dove Cottage بھی اس میں واقع ہے۔ وہ کافی عرصہ تک اس گھر میں مقیم رہے اور اس عرصہ میں بہت سی نظمیں لکھیں۔

بیگم اختر ریاض الدین نے لندن کی بہت سی تاریخی عمارات کا ذکر کیا ہے۔ جس میں ایک اہم عمارت سینٹ پال کا گرجا گھر ہے۔ جو مغربی تہذیب کی شاندار عکاسی کرتا ہے۔ یہ شان و شوکت میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ عمارت سینٹ پال کے نام پر بنائی گئی، جس نے عیسائیت کو ایک نیا رخ دیا۔ یہ عمارت سیاحوں اور مصوروں کے لیے کشش کا باعث بھی ہے۔

سینٹ پال کی قدیم عمارت چوتھی صدی میں بنائی گئی تھی۔ موجودہ عمارت کی تعمیر ۱۶۷۴ء شروع ہوئی اور ۱۷۱۰ء میں مکمل ہوئی۔ یہ ۵۱۰ فٹ لمبا اور ۲۸۲ فٹ چوڑا ہے۔ یہ بارونق جگہ پر واقع ہے۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں انگلستان کے جنگی اور قومی رہنماؤں کی یادگاریں ہیں۔ زیادہ کتبے جنگی بہادروں کے ہیں۔ جن میں ڈیوک آف ولنگٹن زیادہ مشہور ہیں۔ چند بشپوں کے بت بھی نصب ہیں۔ قوم کے نوجوان ان بتوں کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔

برطانیہ کی تاریخی عمارات اس کی عظمت رفتہ کی یاد کو تازہ کرتی ہیں۔ ان عظیم عمارات میں ایک برٹش میوزیم بھی ہے۔ جو قابل دید ہونے کے ساتھ بیش بہا خزانوں کا مالک ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین نے اس کی منظر کشی بہت دلفریب انداز سے کی ہے۔ اس سے ان کی علم دوستی کے ساتھ آثار قدیمہ سے دلچسپی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس میوزیم کو دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ قوم کس قدر کتب اور علم سے محبت کرنے والی ہے۔ یہ میوزیم مغربی تہذیب کی شاندار عکاسی بھی کرتا ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین نے اس میوزیم کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"برٹش میوزیم کی لائبریری کے لیے ایک عمر دراز چاہیے لیکن چھوٹی چھوٹی لائبریریوں میں بھی ہمارے معاشرہ پر زیادہ کتابیں ملتی تھیں۔ بہ نسبت ہماری یونیورسٹیوں اور کالج کی لائبریریوں کے، اگر میں کسی کتاب کی کوئی فرمائش کرتی تو وہاں فوراً منگوا کر دیتے تھے۔"(۳۳)

برٹش میوزیم کا قیام ۱۷۵۹ء میں عمل میں آیا۔ اس میں بیس لاکھ سے زائد نایاب کتب کا ذخیرہ بھی ہے۔ برطانیہ کے کاپی رائٹ کے مطابق ہر کتاب کی ایک جلد برٹش میوزیم میں رکھوانا لازمی ہے۔ اس میں یورپین مطبوعہ کتب اور قلمی نسخے، مشرقی مطبوعہ کتب اور قلمی نسخے، یونانی اور رومی عتیق کی چیزیں، تصاویر، نقشے، سکے اور تمغے رکھے گئے ہیں۔

برطانیہ میں ایک طویل عرصے تک موروثی بادشاہت نظام رہا۔ شروع میں بادشاہ مکمل اختیارات کا مالک تھا۔ تاہم وقت کے ساتھ یہ اختیارات پارلیمنٹ کو منتقل ہوتے گئے۔ اختیارات کی منتقلی کا آغاز ۱۲۱۵ء سے ہوا اور بیسویں صدی میں جا کر مکمل ہوا۔ اب بادشاہ کی حیثیت برائے نام ہے۔ اگرچہ تمام احکامات بادشاہ کے نام پر انجام پاتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر یہ اختیارات کابینہ کے پاس آ گئے ہیں۔ تاہم انہوں نے بادشاہت کو مکمل طور پر ختم نہ ہونے دیا۔ یہ ان کی قدامت پرستی کے ساتھ اپنے روایات سے محبت بھی ہے۔ وہ بادشاہ کو اتحاد کی علامت سمجھتے ہیں۔ یہ قوم بادشاہ کے ہر عمل کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ بادشاہت ان کی تہذیب میں داخل ہو چکی ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین نے مذکورہ تاریخی عنصر کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

"تاریخی لندن کا جس کے پائیہ سلطنت کو پیٹی کوٹ بہت راس آتا ہے خواہ ملکہ کنواری ہو یا بیوہ یا سہاگن اس کے سائے میں پھیلتا پھولتا ہے ہمیں اپنی تاریخ کم پڑھائی گئی اور برطانوی زیادہ۔ ہم پڑھ پڑھ کر خوش ہوتے تھے۔"(۳۴)

بیگم اختر ریاض الدین نے برطانوی سامراجیت کی عکاسی بھی کی۔ انہوں نے اختصار کے ساتھ سامراجی دور اور بعد کی تاریخی صورت حال کی وضاحت بھی کی۔ برطانوی سامراجیت کی تاریخ یوں بیان کی۔

"برطانوی سُورج غروب ہو گیا۔ سامراج سمٹ کر مشترکہ دولت بن گیا اور اس دولت میں بھی پھوٹ پڑ رہی ہے۔ ممالک رسے تڑا رہے ہیں۔ پھر بھی لندن انسان ہے۔ گرم جوش ہے مہذب ہے' محفوظ ہے۔"(۳۵)

ایک دور تھا جب برطانیہ کی حکومت دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر تھی۔ اس نے اپنی طاقت سے بہت سے ممالک کو اپنا محکوم بنالیا۔ مشرق سے مغرب تک ان کی حکمرانی تھی۔ یہ سامراجی نظام بہت عرصہ قائم رہنے کے بعد آہستہ آہستہ زوال کا شکار ہوا، اور ممالک آزادی حاصل کرتے چلے گئے۔ یوں سامراجیت اختتام کو پہنچی اور دولت مشترکہ نے اس کی جگہ لے لی۔ اب دولت مشترکہ میں ۵۳ ممالک شامل ہیں۔ اس کا ہیڈ کوارٹر لندن میں ہے۔ موجودہ دولت مشترکہ کا قیام ۱۹۴۹ء کو عمل میں آیا۔ ملکہ برطانیہ اس کی سربراہ ہیں۔

برطانیہ زندہ اور روشن دماغوں کے لیے جائے پناہ ہے۔ جو لوگ اپنے ملک سے بے دخل کر دیئے جاتے ہیں۔ لندن ان کو پناہ دیتا ہے اور یوں انہیں اپنے فلسفے کو بیان کرنے کا موقع ملتا ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین کہتی ہیں۔ "یہ لندن دنیا کے باغی اور زندہ ذہنوں کی جائے پناہ۔ یہاں کارل مارکس نے اپنا فلسفہ دیکھا۔ "والٹیئر" نے اپنے اشتعال انگیز صفحے چھپوائے۔"(۳۶)

کارل مارکس فلسفہ اشتراکیت کے حوالے سے ایک نمایاں نام ہے۔ مارکس ۱۸۱۸ء کو جرمنی میں پیدا ہوا۔ سرمایہ درانہ نظام کی مخالفت کی وجہ سے اس کو جلاوطن کر دیا گیا۔ اس نے اشتراکیت کے فلسفے کو پیش کرنے کے لیے متعدد کتب لکھیں۔ جن میں نمایاں کیمونسٹ مینی فیسٹو اور داس کیپیٹل ہیں۔ اس نے سرمایہ دارری نظام کی مخالفت کی اور مزدوروں کو جائز حقوق دلوانے کی خاطر یہ فلسفہ پیش کیا۔ والٹیئر نے بھی اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے مقبولیت حاصل کی۔ اس نے اپنے مضامین میں عیسائیت پر کھل پر تنقید کی۔ وہ مذہبی آزادی اور آزادی اظہار کا خواہاں تھا۔ وہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ۲۰۰۰ سے زائد کتب اور پمفلٹ تحریر کیے۔

ب۔ "گوروں کے دیس میں" تہذیبی عناصر:

i. سماج کی نظریاتی سطحوں کی پیشکش:

عطاء الحق قاسمی نے ۱۹۸۹ء میں "گوروں کے دیس میں" کے عنوان سے سفر نامہ تحریر کیا۔ جس کی اشاعت مقبول اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۱ء میں کی۔ آپ کے دوست امجد اسلام امجد اور خالد محمود آپ کے شریک سفر تھے۔ دوران سفر آپ نے لندن کے مختلف مشاعروں میں شرکت کی جن کی سفر نامے میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ آپ کا یہ سفر نامہ برطانیہ کی اسی کی دہائی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سفر کے دوران عطاء الحق قاسمی نے برطانیہ کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں اور انھوں نے مختلف تہذیبی پہلوؤں کا سنجیدگی سے

مشاہدہ کر کے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے مغربی معاشرے کا تنقیدی تجزیہ کیا۔ انہوں نے مغرب کے خاندانی نظام پر شدید تنقید بھی کی۔ ایسا معاشرہ جس میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کا پرچار کیا جاتا ہے، حقیقت کے برعکس اس کا دوسرا رخ بہت ہی بھیانک ہے۔ سفر نامہ نگار کے بقول اہل مغرب نے بزرگوں سے جان خلاصی کے لیے اولڈ سینٹر قائم کر لیے ہیں۔ جہاں سبھی بوڑھے مرد اور عورتیں ہوتی ہیں۔ یعنی یکسانیت کا ماحول ہوتا ہے۔ اس یکسانیت کے ماحول میں بزرگ اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز انسانی قدروں کے منافی ہے۔ جس قدر مغربی معاشرہ انسانی اقدار کا چرچا کرتا ہے اس طرح اقدار پر عمل کرتا نظر نہیں آتا ہے۔ اگرچہ بوڑھوں کو سینئر شہری کا لقب دے کر مراکز میں ان کو ہر سہولت دی جاتی ہے۔ لیکن بوڑھے شہریوں سے بات کرنا پسند نہیں کیا جاتا اور وہ اکتاہٹ اور ڈیپریشن کا شکار نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف مادہ پرستی اور اخلاقی بے راہ روی کی وجہ سے طلاقیں کثرت سے ہوتی ہیں۔ یہ چیز بہت سے سماجی مسائل کا سبب بن رہی ہے۔ خاندان کے ٹوٹنے سے بچے والدین کی شفقت و محبت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف مغربی تہذیب ترقی یافتہ ہے تو دوسری طرف ان کا خاندانی نظام شدید مسائل کا شکار نظر آتا ہے۔ سفر نامہ نگار اس پر ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے۔

> "معاشی خود کفالت اور مادہ پرستی کے جبر کی وجہ سے خاندان کے افراد کا رشتہ آپس میں کمزور ہوتا ہے اور بالآخر ٹوٹ جاتا ہے' چنانچہ طلاقیں ہوتی ہیں' بچے ماں باپ کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں' بہن بھائی کی محبت اور بھائی بہن کی محبت سے محروم رہتا ہے' بوڑھے والدین اولڈ سنٹرز میں اپنے بچوں کی شکلیں دیکھنے کو ترس جاتے ہیں' اعلیٰ انسانی قدریں دم توڑنے لگی ہیں۔"(۳۷)

مغربی ممالک میں یوں تو عورت کو حقوق دینے کی بہت باتیں کی جاتی ہیں لیکن اصل میں وہاں عورتوں کے حقوق کا استحصال ہو رہا ہوتا ہے۔ ایک طرف حقوق نسواں کی تحریک نے عورتوں کے لیے بہت سے حقوق اور آزادیاں حاصل کی ہیں۔ مغرب کی خواتین نے ہر شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ تو دوسری طرف اہل مغرب نے آزادی کے نام پر عورت کا بہت زیادہ استحصال کیا ہے۔ یورپ میں جنسی بے راہ روی نے ایسی خطرناک صورت حال اختیار کر لی ہے جس کے سبب اب کسی کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ اپنے آپ کو مہذب کہلوانے والے اس معاشرے نے عورت کا تجارتی پیمانے پر وسیع استعمال کیا ہے۔ آزادی کے نام پر

جس قدر مغرب نے عورت کی تذلیل کی، شاید ہی کسی اور سماج نے کی ہو گی۔ مغربی تہذیب کے اس تاریک پہلو نے بہت سے سوالوں کو جنم دیا ہے۔ سفر نامہ نگار نے اس پہلو کی منظر کشی یوں کی ہے۔

"سوہو کے علاقے میں فاحشہ عورتیں دیواروں کے ساتھ ٹنگی کھڑی تھیں یہ کسی ہال میں ہونے والے شو میں شرکت کی دعوت 'کاروباری تبسم اور اشاروں کے ساتھ دے رہی تھیں۔ اس علاقے میں جنسی رسالوں' جنسی ادویات اور جنسی اعضا کی دکانیں تھیں' پیپنگ شو تھے جس کے لیے کھڑکی میں سکہ ڈال کر عورت کی تذلیل کا زندہ تماشا دیکھا جاتا سکتا ہے۔"(۳۸)

سفر نامہ نگار ایک اور جگہ مغربی سماج میں عورت کی تذلیل کی مثالیں دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"زندگی کا محور اشیاء کا حاصل کرنا ہے اور اس کی خاطر جوان خوبرو لڑکیاں بدشکل مالدار بوڑھوں کے ساتھ شادی کرتی ہیں' سڑکوں پر بزنس لو کی آوازیں لگاتی ہیں' رسالوں کے لیے عریاں تصویریں اترواتی ہیں سٹیج پر مردوں کے سامنے خلوت کو جلوت بنا دیتی ہیں۔ میرے خیال میں عورت کی جس قدر تذلیل نظام زر نے کی ہے دنیا کا کوئی دوسرا نظام اس کی نظیر پیش کرنے کی "جرات" نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ مگر یہ ظاہر ہے' باطن انتہائی تاریک ہے چنانچہ جو نظام بچوں' بوڑھوں اور بچوں کی تذلیل کرتا ہے' میں اسے تہذیب یافتہ نظام نہیں مانتا۔"(۳۹)

سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظام اگرچہ انسانوں کے فلاح و بہبود کے لیے بنائے گئے ہیں۔ لیکن ایک نظام نے انسانی جسموں کو بے آبرو کر دیا تو دوسرے نے لوگوں کو روحانیت سے محروم کیا۔ سرمایہ داری نظام کی بنیاد ہوس پرستی ہے جو انسان کو آہستہ آہستہ اپنے شکنجے میں کس لیتا ہے۔ چنانچہ تمام تر ترقی اور خوشحالی کے باوجود یہ سماج روحانی مسائل کا شکار ہے اور اس نظام کے خلاف بغاوت پر اتر آتا ہے۔ سفر نامہ نگار نے اس کی وضاحت یوں کی ہے۔

"اگرچہ اس ضمن میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ لوگ سوشلزم فرائی پین سے نکل کر کیپٹلزم کے چولہے میں گرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ویسے یہ دونوں نظام انسانوں کی بہتری کے لیے وضع کیے گئے تھے مگر ایک نے انسانی جسموں کو خرکار کیمپوں کے سپرد کر دیا اور دوسرے نے جسموں کی اتنی پرورش کی کی ان کی روحوں پر بے انت خواہشوں کی چربی چڑھ گئی ہے!"(۴۰)

برطانیہ میں سرمایہ دارنہ نظام رائج ہے۔ جس کے باعث اس نے خوب ترقی کی منازل طے کیں۔ سفر نامہ نگار نے یورپ کی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کا باریکی سے مشاہدہ کیا۔ وہ مختلف جگہوں پر کڑی تنقید بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ سرمایہ دارنہ نظام کی وجہ سے یورپ میں خوشحالی تو آئی تاہم اس نے انسان کی آزادی سلب کرنے کے ساتھ اس کی حقیقی خوشیاں چھین لی ہیں۔ یہ نظام انسان کی فطری اور غیر فطری کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا اور اس کو اپنے شکنجے میں کس لیتا ہے۔ مغرب نے مشینیں تو ایجاد کر لی ہیں لیکن انسان کو بطور ایندھن استعمال کیا جاتا ہے۔ برطانیہ کے شہری دن رات محنت کرتے ہیں تاکہ وہ کریڈٹ کارڈ کے قرضے واپس کر سکیں اور نئے قرضے لینے کی شرائط پوری کر سکیں۔ ان کریڈٹ کارڈوں کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسا ہمارے ہاں بھٹہ مالکان اپنے مزدوروں کو ایڈوانس رقم دیتے ہیں جو کہ وہ ساری عمر واپس نہیں کر پاتے، جس کے باعث وہ بھٹہ مالکان کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ غلامی کی زنجیر ان کے پاؤں میں تاحیات رہتی ہے۔ سفر نامہ نگار کی اس حوالے سے ایک انگریز سے بحث ہوتی ہے۔ "یہ تم نے میرے دل کی بات کہی۔ یہ لوگ کریڈٹ کارڈوں کے قرضے اتارنے کے لیے گدھوں کی طرح کام کرتے ہیں' یہ بھولتے جارہے ہیں کہ انہوں نے انسانوں کے ہاں جنم لیا تھا۔ "[۴۱] سفر نامہ نگار نے اہل مغرب کی مادہ پرست زندگی پر بھی تنقید کی۔ وہ ایسے نظام کے سخت مخالف ہیں۔ جس میں انسان کی حیثیت ایک مشین جیسی ہو جاتی ہے۔

ii. مذہبی عناصر کی پیشکش:

سفر نامہ نگار نے سفر برطانیہ میں جس طرح اور تہذیبی عناصر کا مشاہدہ کیا ہے وہاں آپ نے برطانیہ میں پائے جانے والے مختلف مذاہب کو پیش کیا ہے۔ مذہب تہذیب کا ایک اہم عنصر ہے۔ یورپ میں ایک طویل عرصے تک کلیسا کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ برطانوی سماج میں پادری کو حد درجہ مقام اور عزت حاصل تھی۔ لیکن سولہویں صدی میں نشاۃ ثانیہ کے بعد کلیسا کا اثر و رسوخ بہت کم رہ گیا ہے۔ تاہم اب بھی پادریوں کو مغربی تہذیب میں نمایاں مقام حاصل ہے اور ان کو قدر و منزلت دی جاتی ہے۔ مغرب میں اب بھی اکثریت کا مذہب عیسائیت ہے۔ تاہم ان کی عملی زندگیوں میں مذہب کا عمل دخل کم ہوتا جارہا ہے۔ اہل مغرب مذہب کو ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں۔ یہ صرف چند مذہبی رسومات بجالاتے ہیں۔ یہ صرف اتوار کو چرچ چلے جاتے اور پادریوں کو نذر و نیاز پیش کرتے اور اپنے سر پر نمک چھڑواتے ہیں۔

مغرب میں مادہ پرستی اور بے راہ روی کے باوجود چرچ کو اب بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ سفر نامہ نگار کے مشاہدے میں یہ بات آتی ہے کہ اہل مغرب قدامت پرست بھی ہیں۔ یہ اپنی برسوں پرانی روایات کا

احترام کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کہتے ہیں۔

"براؤنٹی سسٹرز کے گھر کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان کے لکھنے کے میز' ان کے مسودے' ان کے ملبوسات۔ سب کچھ اس مکان میں موجود ہیں اور انسان ایک دم خود کو کوئی سو برس پرانے انگلینڈ میں محسوس کرتا ہے۔ یہاں وہ چرچ بھی موجود ہے جہاں ان کا باپ پادری تھا اور ان کا آبائی قبرستان بھی۔ جہاں وہ دفن ہیں یہ چھوٹا سا بے حد خوبصورت قصبہ ہے۔"(۴۲)

عطاء الحق قاسمی کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے چنانچہ مذہبی پہلو پہ بات کرتے ہوئے ان کے قلم میں روانی ہوتی ہے۔ انہوں نے مغرب میں موجود مسلم تہذیبی عناصر کا ناقدانہ جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ یہاں ایک طرف مسلمانوں کے مغربی تہذیب میں مدغم ہونے سے پریشان ہیں وہاں انھیں خوشی بھی ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنی اقدار و روایات سے جڑا ہوا ہے۔ یہ مغربی تہذیب کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنی تہذیب اور ثقافت سے وابستہ ہیں۔ بچے، مرد اور خواتین سبھی اپنی اقدار کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی مذہبی رسومات کو ایسے ہی بجالاتے ہیں جیسا کہ یہ مسلم معاشرہ میں رہ رہے ہوں۔ سفر نامہ نگار کو یہ سب دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ یورپ میں نہیں بلکہ پاکستان میں آگیا ہو۔ مغربی تہذیب کی رنگارنگی ان کو متاثر کرنے میں ابھی تک کامیاب نہ ہو سکی۔ سفر نامہ نگار اس لیے بھی فکر مند ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی روایات کے تحفظ کے لیے مناسب اقدامات کرنا ہوں گے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مسلمان مغربی تہذیب میں مدغم ہو کر رہ جائیں گے۔ عطاء الحق قاسمی نے ایک مذہبی تقریب کی منظر کشی یوں کی ہے۔

"نماز کی ادائیگی کے بعد نمازیوں کے علاوہ اور بہت سے پاکستانی مرد' خواتین اور بچے بھی جمع ہیں۔ خواتین کے لیے ایک علیحدہ جگہ مختص ہے۔ ایک پاکستانی کی اہلیہ انتقال کر گئی ہیں۔ ان کے لیے قرآن خوانی کی جارہی ہے۔ فضا میں ایک گہری اداسی ہے۔ قرآن خوانی کے بعد میں اور صفی حسن اس پاکستانی دوست سے تعزیت کی۔ اس وقت میں برمنگھم کی جامع مسجد میں نہیں ایک چھوٹے سے پاکستان میں ہوں۔ شلوار کُرتے میں ملبوس بچے، سروں پر دوپٹہ اوڑھے ہوئی خواتین، رومال سے سروں کے ڈھانپے ہوئے مرد، دورو و سلام، قرآنی آیات کی تلاوت، میں اس وقت مغربی تہذیب کے سمندر میں واقع ایک جزیرے میں ہوں مگر تھوڑی دیر بعد جب یہ محفل ختم ہو گی اس کے شرکاء کو دوبارہ اس سمندر کے تھپیڑوں سے بچاؤ کی تدابیر سوچنا ہوں گی۔"(۴۳)

مہمان نوازی جو کہ مسلم تہذیب کا خاصا ہے۔ یہ چیزیں برطانوی مسلمانوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کی ملاقات صوفی اسماعیل صاحب سے ہوتی ہے جو کہ مہمانوں کی خدمت خوشی سے بجالاتے ہیں اور اسلام کی تبلیغ کے لیے کوشاں ہیں۔ بریڈ فورڈ میں مقیم پاکستانیوں کی اکثریت اپنی تہذیب و ثقافت کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ یہ بات مغرب میں مسلمانوں کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ عبادت گاہوں کا قیام یا ان کے تحفظ کا مسئلہ ہو، یہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ مساجد جو کہ مسلم تہذیب کے فروغ میں نمایاں کام انجام دیتی ہیں۔ ان کی تعداد وقت کے ساتھ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ سفر نامہ نگار کہتا ہے۔

"بریڈ فورڈ میں پاکستانی خاصی تعداد میں آباد ہیں، ان کی تعداد ساٹھ ہزار سے زائد ہے اور ان کی اکثریت اپنے مذہب اور ثقافت سے پوری طرح وابستہ ہے۔ ہماری یہاں ملاقات صوفی اسماعیل سے ہوئی۔۔۔۔۔ مہمانوں کو مسلسل بتا رہے تھے کہ انہیں مہمانوں کی خدمت سے خوشی ہوتی ہے اس لیے کہ مہمان خود کو ان پر بوجھ محسوس نہ کریں۔ صوفی صاحب نے بتایا کہ بریڈ فورڈ میں ۶۵ مساجد ہیں اور اب ہم ان کی تعداد میں اضافے کے بجائے ان کی افادیت کو مستحکم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔"(۴۴)

برطانیہ میں رہنے والے مسلمان اپنے مذہب سے بھرپور لگاؤ رکھتے ہیں۔ یہ اپنی مذہبی عبادات احسن طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ برطانیہ میں پرورش پانے والی نئی نسل اپنے مذہب سے وابستہ ہے۔ انہوں نے عملی زندگی میں مذہبی اقدار کو اپنایا ہوا ہے۔ وہ مغربی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی مذہب کی طرف راغب ہیں۔ یعنی مغرب کی چکاچوند زندگی نے ابھی تک ان کو مغلوب نہیں کیا۔ سفر نامہ نگار ان کا تقابل پاکستانی بچوں سے بھی کرتا ہے اور ان کو پاکستانی بچوں کی نسبت بہتر قرار دیتا ہے۔ اسی سبب مصنف کے تجربے اور معلومات میں جو چیز آئی ہے وہ یہ ہے کہ برطانیہ میں جنم لینے اور پروان چڑھنے والی نئی نسل مذہب کو مثبت انداز سے لیتی ہے۔

"ان میں سے بیشتر کی جڑیں ثقافت اور مذہب میں خاصی گہری ہیں۔ مگر صرف اس صورت میں اگر والدین کو اس طرف دلچسپی ہو۔ تمہارے لیے یہ بات باعث حیرت ہو گی کہ یہاں جو بھی مسلمان بچہ مذہب کی طرف راغب ہوتا ہے' وہ پاکستانیوں کے برعکس اپنے کردار میں انتہائی مضبوط ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا، دھوکا نہیں

کرتا، دوغلے پن سے نفرت کرتا ہے۔"(۴۵)

سفرنامہ نگار برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کے مستقبل کے حوالے سے شدید کشمکش اور پریشانی میں مبتلا نظر آتا ہے کہ کہیں مسلم تہذیب وقت کے ساتھ مغربی تہذیب کے زیر اثر نہ آ جائے۔ مغربی تہذیب کی رنگا رنگی اور اخلاقی بے راہ روی ان کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ سفرنامہ نگار کا کہنا ہے کہ کچھ ذہنوں کی یہ محض خام خیالی ہے جو کہتے ہیں کہ یورپ کا آئندہ مذہب اسلام ہو گا۔ مغربی تہذیب کی یلغار ان کو اپنی رنگ میں رنگ لے گی اور وہ اپنی روایات کو بھول جائیں گے۔ سفرنامہ نگار کا مقصد مسلمانوں کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ اپنی روایات کا تحفظ کریں۔ وہ کہتے ہیں۔

> "شعری محفلیں اجڑ چکی ہوں گی اور خاکم بدہن بہت سے مسجدیں کلب میں تبدیل ہو جائیں گی۔ یہاں بزرگ کی حیثیت سے نہیں اولڈ پیپلز ہوم میں اپنی زندگی گزار رہے ہوں گے جہاں انہیں اپنے بیٹے کی طرف سے عید یا (خدانخواستہ) کرسمس کے موقع پر تہنیتی کارڈ موصول ہو گا۔ پچاس سال بعد کے جن اندیشوں کا میں نے تذکرہ کیا ہے' برطانیہ میں اسلام اور پاکستان کے لیے بے پناہ کام کرنے والے اداروں کے سرگرم رکن میری اس کھینچی ہوئی تصویر سے متفق نہ ہوں گے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یورپ کا آئندہ مذہب اسلام ہے مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں۔"(۴۶)

مغرب میں زیادہ تر مسلمان تو اپنی اقدار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لیکن ایک ایسا گروہ بھی ہے جو کہ مغربی تہذیب کے زیر اثر آ چکا ہے۔ سفرنامہ نگار اس حوالے سے شدید خدشات کا شکار ہے کہ مسلمانوں کو اپنی اقدار بچانے کے لیے راست اقدامات کرنا ہوں گے۔ اپنی نئی نسل کو روایات سے وابستہ رکھنے کے لیے فکرمند ہونا پڑے گا۔ انہوں نے اس کی وضاحت یوں کی۔

> "ڈیلی میل کے اس شمارے میں دو تصویریں بھی ایک ساتھ دی گئی تھیں جن میں سے ایک مسلمان ماڈل گرل سفیرہ کی تصویر تھی جو ڈانس کے پوز میں تھی جب کہ اس کے برابر والی تصویر میں ایک مسلمان لڑکی اپنے سر اور پورے جسم کو چادر سے لپیٹے مولوی صاحب سے قرآن پڑھ رہی تھی۔"(۴۷)

سفرنامہ نگار کے مشاہدے سے اس بات کا بھی ادراک ہوتا ہے کہ برطانیہ میں مقیم کچھ مسلمان اپنی اقدار سے روگردانی کر چکے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح سے مغربی تہذیب کے زیر اثر آ چکے ہیں۔ لیکن دوسری

طرف ایسے مسلمان بھی ہیں جو اپنی مذہبی اقدار و روایات پر قائم ہیں۔ مغرب کی پر رونق زندگی ان کو متاثر نہ کر سکی۔ دراصل یہ تصویر مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ انہیں اپنی آنے والی نسلوں کو اپنی تہذیبی و ثقافتی روایات سے آگاہ کرنا ہوگا۔ اپنی اقدار کو بچانے کے لیے راست اقدامات بھی کرنا ہوں گے۔

سکھ مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ یہ اپنی مذہبی روایات سے کبھی انحراف نہیں کرتے۔ مغربی تہذیب کی پر رونق زندگی بھی ان کو متاثر نہ کر سکی۔ یہ ہر حال، ہر جگہ اپنی تہذیب سے جڑے رہتے ہیں۔ سفر نامہ نگار نے اس کی منظر کشی دلکش انداز میں کی ہے۔

"یہ جاگیر سنگھ چوہان ہے۔ صحافی ہے 'شاعر ہے 'میرا یار ہے۔" حسن نے تعارف کرایا۔
جاگیر سنگھ چوہان نہیں جے ایس چوہان کہو' میں کسی مذہب وزہب پر یقین نہیں رکھتا۔
جاگیر سنگھ سے مذہبی وابستگی کی بو آرہی تھی۔"(۴۸)

برطانیہ میں ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد رہ رہی ہے۔ مسلمانوں کی برعکس ہندوؤں نے مغربی تہذیب کا زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ مغرب کی چکاچوند زندگی نے انہیں مرعوب کر دیا ہے۔ بھارتی خواتین اپنی اقدار سے روگردانی کر کے اکثر انگریزوں سے شادی تک کر لیتی ہیں۔ سفر نامہ نگار اس حوالے سے ایک بھارتی شہری ششی بھوشن جوشی سے ملاقات ہوتی ہے۔ جوشی نے مغرب میں موجود بھارتی شہریوں کی صورت حال کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

"مغرب میں جو ایشائی خواتین آباد ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی بھی ہیں جنہوں نے یہاں کی تہذیب کا اثر کچھ زیادہ قبول کر لیا ہے۔ خاص طور پر وہ نسل جو یہاں پیدا ہوئی اور جس نے مادہ پرستی کے ماحول میں پرورش پائی۔ ان کی ایک تعداد اپنے والدین کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں اور بدقسمتی سے ہماری بھارتی خواتین میں یہ لہر زیادہ ابھر کر سامنے آئی ہے چنانچہ ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے کہ وہ گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔"(۴۹)

عطاء الحق قاسمی برطانیہ میں موجود مذہبی عناصر کا مشاہدہ کر کے اپنا تجزیہ پیش کرنے کی سعی کی۔ وہ بالخصوص برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ کس طرح مذہبی اقدار پر قائم ہیں۔ تاہم کچھ مسلمانوں کا طرزِ زندگی انہیں ذہنی کرب میں بھی مبتلا کرتے ہیں اور وہ برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کو اپنی روایات پر کاربند رہنے کی تاکید کرتے ہیں کسی قوم کی بقا کا انحصار اپنی اقدار کو اپنانے میں ہی ہے۔

iii. نسلی، لسانی اور تاریخی عناصر کی پیشکش:

نسلی عناصر:

برطانیہ میں بسنے والوں کی اکثریت انگریزوں کی ہے۔ اس قوم کا شمار دنیا کی نفاست پسند اقوام میں ہوتا ہے۔ ان کی حد درجہ نفاست نے اس تہذیب کو پرکشش بنا دیا ہے۔ مادہ پرستی کے باوجود یہ قوم ہر شعبہ ہائے زندگی میں اعلیٰ اقدار کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ اپنی زندگیوں سے بھرپور طریقے سے لطف اٹھانے والی قوم ہے۔ ان کی ایک خاص خوبی ان کا سیاحت سے والہانہ لگاؤ بھی ہے۔ سفر نامہ نگار اس کا جائزہ یوں لیتے ہیں۔

> "آج موسم بہت خوشگوار تھا' دھوپ نکلی ہوئی تھی چنانچہ انگریزیوں کے چہروں پر بھی شتابی کے آثار کم کم تھے اور وہ ریلیکسنگ کے موڈ میں دکھائی دیتے تھے ۔۔۔ مجھے مغرب کی ایک بات بہت اچھی لگتی ہے۔ ایک تو بقول طارق طور " یہاں گرد بالکل نہیں ہے "(۵۰)

سکاٹ لینڈ بھی برطانیہ کا حصہ ہے۔ جس کے باشندوں کو سکاٹش کہا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار نے سکاٹش لوگوں کو اپنے وطن میں موجود پٹھانوں سے تشبیہ دی ہے۔ سکاٹش برطانیہ سے زیادہ خوش نظر نہیں آتے۔ ان کے خیال کے مطابق برطانیہ سکاٹ لینڈ کی خوشحالی کے لیے خاطر خواہ اقدامات نہیں اٹھاتا اور نہ ہی سکاٹش لوگوں کی مناسب اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ چیز انگریزوں اور سکاٹش لوگوں کے درمیان گہری خلیج کو ظاہر کرتی ہے۔ سفر نامہ نگار اس کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے۔

> "اب ہم مسافروں کی اگلی منزل گلاسگو تھی۔ گلاسگو' سکاٹ لینڈ کا ایک اہم شہر ہے۔ سکاٹش لوگ شکل و شباہت میں ہمارے پٹھانوں جیسے ہیں۔ سکاٹ لینڈ' برطانیہ کا حصہ ہوتے ہوئے بھی برطانیہ سے اپنے تعلق کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔"(۵۱)

برطانیہ میں یہاں اور کئی نسلوں کی لوگ آباد ہیں، وہیں جنوبی افریقہ سے تعلق رکھنے والے رہائش پذیر ہیں۔ یہ دوسرے ملک میں رہتے ہوئے اپنے ملک اور شہریوں سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اور اپنی حکومت کی نسلی پالیسیوں کی خلاف کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ یہ سفید فام ہوتے ہوئے بھی اپنے ملک میں سیاہ فام سے ہونے والی امتیازی سلوک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سفر نامہ نگار نے اس کی عکاسی یوں کی ہے۔

> "پکاڈلی سرکس کے علاقے میں جنوبی افریقہ کے سفارت خانے کے پاس نوجوانوں کی ایک ٹولی ہاتھوں میں بینر اٹھائے جنوبی افریقہ کی نسلی پالیسیوں کے خلاف مظاہرہ کر

رہی تھی۔ یہ نوجوان سفید فام ہوتے ہوئے جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت کی رسوائے زمانہ اور ننگ پالیسیوں پر نفرت بھیج رہے تھے۔"(۵۲)

یورپ میں سکھ نسل بھی کثیر تعداد میں آباد ہے۔ ان میں زیادہ تر کا تعلق بھارت سے ہے۔ سکھ اپنے مخصوص انداز اور اقدار سے آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ اپنی اقدار و روایات سے وابستگی ان کی تہذیب کی خوبصورتی ہے۔ یہ اپنی محنت کی بدولت برطانوی سماج میں عزت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ صاف گوئی اور خلوص میں اپنی مثال آپ رکھتے ہیں۔ سفر نامہ نگار سکھ نسل کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں۔

"ایک سردار جی کمر کے ساتھ باندھنے والے بٹوے بیچ رہے تھے۔ میں ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"سردار جی! یہ بٹوے کیسے ہیں؟" میں نے ایک بٹوہ اٹھا کر پوچھا

"بکواس ہیں جی!" سردار جی نے صاف گوئی کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا۔"(۵۳)

برطانیہ میں پاکستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد رہتی ہے۔ سفر نامہ نگار کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نہ صرف مغربی تہذیب کی یلغار سے بچے ہوئے ہیں۔ بلکہ اپنی روایات اور خلوص سے اپنی پہچان آپ رکھتے ہیں۔ اگر کوئی پاکستانی ان سے ملے تو گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے اور مہمان نوازی بجالاتے ہیں۔ مہمان نوازی دراصل مسلم تہذیب کا خاصا ہے۔ ان کی اس اپنائیت سے خاص یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور اپنے وطن سے دوری کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

"بریڈ فورڈ میں جا کر پاکستان کا احساس صرف انہی مظاہر سے نہیں ہوتا' بلکہ پاکستانیوں کی بے پناہ گرمجوشی اور ان پاکستانی قدروں سے ہوتا ہے جو مغرب کے مادہ پرست ماحول میں بھی انہوں نے بچا بچا کر رکھی ہوئی ہیں۔ مجھے یہاں بال کٹوانے کے لیے جانا پڑا۔۔۔۔ ہیئر ڈریسر نے خالص پاکستانی مہمان نوازی کے انداز میں پوچھا۔ "آپ ٹھنڈا پیئں گے کہ گرم؟"(۵۴)

بہت سے بھارتی شہری بھی تلاش روزگار کے سلسلے میں یہاں مقیم ہیں۔ ان میں سے کچھ نے یہاں کی شہریت بھی حاصل کرلی ہے۔ یہ محنت سے پیسہ کما کر اپنی اور اپنے خاندان والوں کی کفالت کر رہے ہیں۔ کچھ نے جائیدادیں بھی حاصل کر لی ہیں۔ انگریز اپنے ملک میں رہائش پذیر دوسرے ملک کے لوگوں کو اچھا نہیں

سمجھتے، شاید اس کا سبب یہ ترقی بھی ہے۔ اس سے انگریز قوم کے تعصب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ سفر نامہ نگار انگریز قوم کی عیاشیوں کا ذکر بھی کرتا ہے کہ وہ اپنا وقت اور پیسہ فضول کاموں میں ضائع کرتے ہیں اور کنگالوں جیسی زندگی گزارتے ہیں۔

"جو پاکستانی اور بھارتی اپنے وطن چھوڑ کر برطانیہ آ بسے ہیں' وہ سخت محنت سے پیسے کماتے ہیں' اس سے جائیدادیں خرید لیتے ہیں' جبکہ انگریز تھوڑی بہت محنت کر کے پیسہ کماتا ہے ' وہ الے تللوں میں ضائع کر دیتا ہے۔ ہم لوگ یہاں بہترین گاڑیوں میں پھرتے ہیں اور یہ انگریز اپنے ملکوں میں کنگالوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔"(۵۵)

سفر نامہ نگار نے برطانیہ میں آباد مختلف نسلی عناصر کا جائزہ لیا ہے اور ہر نسل کی امتیازی خصوصیات کو نمایاں کیا ہے۔

لسانی عناصر:

برطانیہ کی قومی زبان انگریزی ہے جو کہ پانچویں صدی اینگلو سیکسن کے دور سے برطانیہ میں بولی جا رہی ہے۔ یہ ۶۷ ممالک کی سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ قدیم زبان تیزی سے ترقی کرتی ہوئی اب بین الاقوامی زبان کا درجہ پا چکی ہے۔ انگریز قوم کو اپنی زبان پر ناز ہے۔ یہ زبان مغربی تہذیب کا حصہ بننے کے ساتھ مغربی تہذیب کو دوسرے معاشروں میں منتقل بھی کر رہی ہے۔ سفر نامہ نگار کہتا ہے۔

"انڈر گراؤنڈ ٹرین کبھی سرنگ میں داخل ہو جاتی اور کبھی کھلی فضاؤں میں فراٹے بھرنے لگتی۔۔۔۔۔۔ایک اسٹیشن پر ٹرین رکی تو دو نشستیں خالی ہوئیں جن پر ایک بوڑھا انگریز اور اس کا گیارہ سالہ بچہ بیٹھ گئے اچانک انگریز کی نظر مجھ پر پڑی اس نے بچے سے کہا کہ وہ میرے لیے نشست خالی کر دے۔"(۵۶)

اگرچہ برطانیہ کی اکثریت انگریزی زبان بولتی اور سمجھتی ہے لیکن انگریزی کے علاوہ دیگر کئی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ دوسری اقوام کے لوگ جو کہ برطانیہ میں رہائش پذیر ہیں وہ اپنے بچوں کو انگریزی زبان بولتے دیکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کے نزدیک یہ بات ان کی احساس کمتری کی غمازی کرتی ہے جو اپنی اقدار کو بھول کر دوسری تہذیب کو اپنا رہے ہیں۔ سفر نامہ نگار کی خواہش ہے کہ مشرقی اقدار کو نہ بھولا جائے۔

"انگلینڈ میں جو پاکستانی آباد ہیں ان کی زیادہ تعداد آزاد کشمیر اور پنجاب سے تعلق رکھتی

ہے۔۔۔۔مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بچے پنجابی صرف اپنے والدین کے ساتھ بولتے ہیں۔ آپس میں ہمیشہ انگریزی میں بات کرتے ہیں ان میں کچھ احساس کمتری کا شکار ہیں وہ اپنے بچوں کو انگریزی بولتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور فرط محبت سے سینے سے لگا کر کہتے ہیں "آہا" میرا بیٹا تو کسی انگریز کا بیٹا لگتا ہے۔"(۵۷)

اردو برطانیہ میں تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ یہاں مقیم پاکستانیوں نے اردو زبان کے فروغ کے لیے مختلف کتب خانے قائم کر رکھے ہیں۔ ان مراکز میں بے شمار اردو کی کتابیں دستیاب ہیں۔ اس سے ایک طرف اردو زبان کو فروغ مل رہا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کی اپنی اقدار و روایات پھل پھول رہی ہیں۔ سفر نامہ نگار کے حوالے سے مغربی تہذیب کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر برطانیہ میں کوئی زبان تیزی سے پھیلی ہے، تو وہ اُردو ہے۔

"بریڈ فورڈ میں ایک ایسی دکان دیکھی کہ بس دل باغ باغ ہو گیا۔ اس دکان کا نام "بک سنٹر" ہے اور اس کے مالک افتخار قریشی ہیں۔ بک سنٹر یورپ کا سب سے بڑا اردو کتابوں کا مرکز ہے۔ یہاں مختلف موضوعات پر کتب دستیاب ہیں اور یوں ایک لاکھ سے زیادہ اردو کتابیں یہاں موجود ہیں اور پورے یورپ یہاں تک کہ امریکہ تک سپلائی ہوتی ہیں۔"(۵۸)

یہاں رہائش پذیر پاکستانیوں اور بھارتیوں کی ایک بہت بڑی تعداد اُردو زبان بولتی ہے۔ سفر نامہ نگار کے مشاہدے سے ہمیں آگاہی ہوتی ہے کہ اب بریڈ فورڈ میں مختلف جگہوں پر آویزاں اشتہارات اُردو زبان میں ہوتے ہیں۔ جس سے مغربی تہذیب میں اردو زبان کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اشتہارات برطانیہ میں اردو زبان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہیں۔

"لیکن بریڈ فورڈ میں پاکستانی زیادہ کثیر تعداد میں ہونے کی وجہ سے اپنے وطن کی بو باس زیادہ محسوس ہوتی ہے' یہاں تو کئی جگہ اردو کے سائن بورڈ بھی نظر آجاتے ہیں اور کچھ اس طرح کے اشتہار بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ "ممتاز پان ہاؤس"، "ایک بار آزمایئے بار بار آیئے"(۵۹)

یہاں سکھ بھی کثیر تعداد میں رہ رہے ہیں۔ سکھوں کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ اپنی زبان اور روایات سے ہمیشہ جڑے رہتے ہیں۔ یہ دنیا کے کسی کونے میں آباد ہوں، اپنی اقدار و روایات کو برقرار رکھیں گے۔ یہ

منفرد انداز سے پنجابی زبان بولتے اور انہیں اس پر فخر بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ برطانیہ میں پنجابی بھی تیزی سے فروغ پا رہی ہے۔ سفر نامہ نگار خود بھی پنجابی سے خاصی الفت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہیں یہ چیز بہت پسند آتی ہے کہ مغربی تہذیب میں رہتے ہوئے بھی یہ سکھ اپنی زبان کو فوقیت دیتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کی دوران سفر ایک سکھ سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ انہیں اس طرح مخاطب کرتا ہے۔ "باباجی اپنی ادھ کھلی آنکھوں کو پوری کھولنے کی کوشش کے دوران حسن پر ایک نظر ڈالی اور کہا 'گرودی کرپا اے تیرا کیہ حال اے ہر نام سنگھا؟"(۶۰) اسی طرح ایک اور جگہ پر وہ ایک سکھ سے ملاقات کی داستان اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ایک سردار جی کمر کے ساتھ باندھنے والے بٹوے بیچ رہے تھے۔۔۔۔۔۔میں نے آگے بڑھنے سے پہلے سردار جی کو مخاطب کیا۔" سردار جی ایک بات تو بتائیں!"

"پچھو' بادشاہو پچھو"

"یہ دکان آپ کی اپنی ہے یا شریکوں کی ہے۔"(۶۱)

سفر نامہ نگار لسانی عناصر بیان کرتے ہوتے ہوئے ایک بات پر اطمینان محسوس کرتا ہے کہ پاکستانی اپنی زبان بولتے ہیں اور اس کے فروغ میں نمایاں خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ تاہم وہ اس پر فکر مند بھی لگتے ہیں کہ کہیں یہ اپنی روایات کو بھول نہ جائیں۔

تاریخی عناصر:

عطاء الحق قاسمی کا تاریخی شعور بہت گہرا ہے۔ اپنے سفر لندن کے دوران انہوں نے بہت سے تاریخی مقامات کی منظر کشی اپنے منفرد انداز سے کی ہے۔ جو قارئین کے لیے معلومات کا ایک وسیع خزانہ ہے۔ تاریخی مقامات کی سیر اور مشاہدہ ان کی تاریخی ورثے سے گہری وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ آثار قدیمہ پر ماہرانہ تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے گہرے تاریخی شعور سے ہمیں برطانیہ کے مختلف تاریخی مقامات اور شخصیات کے بارے میں آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ وہ تاریخی عناصر کو پیش کرتے وقت کبھی کبھی ظرافت سے بھی کام لیتے ہیں۔ لیکن ان کے طنز کے نشتر کسی کی ذات کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ وہ سفر برطانیہ کے دوران برٹش میوزیم بھی گئے۔ برٹش میوزیم میں مسلمانوں کی تاریخ کا مختصر گوشہ بھی ہے۔ سفر نامہ نگار کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ جس قدر عظیم اور وسیع ہے لیکن اس میوزیم میں اس کو پیش کرتے وقت تعصب سے کام لیا گیا اور اسلامی آثار کو بہت کم کرکے دکھایا گیا۔ سفر نامہ نگار کہتے ہیں۔

" برٹش میوزیم میں گھومتے ہوئے اسلامی آثار پر مشتمل مختصر سا گوشہ دیکھ کر مجھے

حیرت ہوئی۔ مسلمانوں نے اتنے تھوڑے عرصہ تک دنیا میں حکومت نہیں کی جتنا کہ
اس مختصر سے گوشے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔"(۶۲)

برٹش میوزیم کا شمار برطانیہ کے بڑے میوزیم میں ہوتا ہے۔ اس میوزیم میں دنیا بھر سے ۲۰ لاکھ سے زائد مختلف زبانوں کے قلمی نسخے رکھے گئے ہیں۔ اس کا شمار برطانیہ کی قدیم تاریخی عمارتوں میں ہوتا ہے۔

سفر نامہ نگار نے دریائے ٹیمز کا احوال کا ذکر کیا ہے۔ سفر نامہ نگار کے مشاہدے میں آتا ہے کہ شعراء نے اس کی اہمیت اور خوبصورتی پر اتنی نظمیں اور قصیدے کہے کہ یہ اب اہل مغرب کی تاریخ کا حصہ بن گئے۔ دنیا بھر کے سیاح جب لندن آتے ہیں تو دریائے ٹیمز کی لازمی سیر کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار اس دریا کی تصویر کشی کچھ اس طرح کرتا ہے۔ "ہم جس طرف چلتے دریائے ٹیمز ہمارے سامنے آجاتا۔ اس سے مل کر مجھے خاصی مایوسی ہوئی گدلا' گدلا' ڈھیلا ڈھالا' انگریز شاعروں نے اس کے قصیدے لکھ لکھ کے اس کا اور ہمارا دماغ خراب کیا ہوا تھا۔"(۶۳) سفر نامہ نگار اس کی تاریخ بیان کرتے ہوئے طنز سے کام لیتا ہے۔ یہ اپنے کنارے رونما ہونے والے عجیب و غریب واقعات کا چشم دید گواہ ہے۔ یہ لندن کی مہذب اور غیر مہذب زندگی پر مسکراتا ہے۔ "یہ آپ کو اپنے کنارے پر رونما ہونے والے عجیب و غریب واقعات سنائے گا۔ جب لندن غیر مہذب لوگوں کا مسکن تھا۔ یہ انہیں دیکھ کر مسکراتا تھا اور آج اس کے تہذیب یافتہ ہونے پر مسکراتا ہے۔"(۶۴)

سفر نامہ نگار اپنے سفر کے دوران ڈاؤننگ سٹریٹ بھی گیا۔ اس عمارت کا شمار بھی برطانیہ کی تاریخی عمارتوں میں ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۶۸۴ء میں ہوئی۔ یہ برطانوی حکومت کا ہیڈ کوارٹر اور وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ بھی ہے۔ اس کا پہلا نام ٹاؤن ہاؤس تھا۔ یہاں وزیر اعظم مختلف میٹنگز کی سربراہی کرتے ہیں۔ یہ عمارت لندن کے مرکز میں واقع ہے۔ سفر نامہ نگار نے اپنے سفر نامہ میں اس کا سرسری ذکر بھی کیا ہے۔ "یہاں سے اٹھ کر ہم لوگ ڈاؤننگ سٹریٹ پر واقع وزیر اعظم کی رہائش گاہ کی طرف گئے جہاں پر پہرے پر کھڑے پتھر کی مورتی جیسے سپاہی کے ساتھ تصویر اتروائی۔"(۶۵)

کسی بھی ملک کے عجائب گھر اس کی قدیم تہذیب اور کلچر کے بارے صرف معلومات فراہم نہیں کرتے بلکہ نوادر کی صورت میں زندہ درس گاہ کا درجہ پالیتے ہیں۔ لہذا ان کی ضرورت اور افادیت سے انکار کسی صورت ممکن نہیں۔ سفر نامہ نگار مادام تساؤ کے عجائب گھر کی بھی منظر کشی عمدہ طریقے سے بیان کرتا ہے۔ یہ عجائب گھر اب برطانیہ کا اہم تہذیبی ورثہ بن چکا ہے۔ اس عظیم الشان عجائب گھر نے سفر نامہ نگار کو بہت متاثر کیا۔ لندن کے اس معروف عجائب گھر میں مختلف شخصیات کے مومی مجسمے رکھے جاتے ہیں۔ اس میں ہالی وڈ کے

اداکار'فلمی ہیروز اور شاہی خاندان کے تاریخی شخصیات کے مومی مجسمے رکھے گئے ہیں۔ان میں لینن'شاہ فیصل' ملکہ الزبتھ'پنڈت نہرو اور دوسری عالمی سیاسی شخصیتوں اور اس کے علاوہ کھلاڑیوں'موسیقاروں اور شاعروں کے مومی پتلے رکھے گئے ہیں۔ مادام تساؤ کا عجائب گھر مغربی تہذیب کی شاندار عکاسی کرتا ہے۔ مادام تساؤ ۱۷۶۱ء میں فرانس میں پیدا ہوئیں۔جب مادام تساؤ دو سال کی ہوئیں تو انھوں نے مجسمہ سازی شروع کر دی تھی۔ مجسمہ سازی کا فن آپ نے اپنی والدہ سے سیکھا۔ مجسمہ سازی میں ان کی مہارت کمال کی تھی۔ ان کے بنائے ہوئے مجسمے بہت حد تک اصل محسوس ہوتے تھے۔انہوں نے سب سے زیادہ مومی مجسمے ملکہ ایلزبتھ کے بنائے۔مادام تساؤ کی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی انہیں تاریخ میں امر کر گئی۔ سفر نامہ نگار مادام تساؤ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> "مادم توساد کا مومی پتلوں پر مشتمل عجائب گھر انسانی ہاتھوں کی کاریگری کا ایک محیر العقول کارنامہ ہے۔ یہاں دنیا کی مختلف نامور شخصیتوں کے مومی پتلے تیار کر کے رکھے گئے ہیں۔ جنہیں تھوڑے عرصے بعد ہٹا کر ان کی جگہ کسی دوسری شخصیت کا پتلا رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ پتلے ناقابل یقین حد تک اپنے زندہ ہونے کا دھوکا دیتے ہیں۔"(۶۶)

سفر نامہ نگار نیشنل آرٹ گیلری بھی گئے۔ یہ عظیم الشان عجائب گھر ۱۸۲۴ء میں بنایا گیا۔لندن کی یہ تاریخی عمارت میں ۲۳۰۰ سے زائد پینٹنگز رکھی گئی ہیں۔ مصوروں کی شاندار پینٹنگز سے اہل یورپ کی فنون لطیفہ سے دلچسپی اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس تاریخی گوشے نے برطانوی تہذیب کو نمایاں کرنے میں بھرپور معاونت کی۔ سفر نامہ نگار اس عجائب گھر کی تصویر کشی اس طرح کی ہے۔"اب ہم نیشنل آرٹ گیلری میں دنیا کی ممتاز مصوروں کی پینٹنگز میں گھرے ہوئے تھے۔ یہاں کلاسیکی مصوروں کی نہایت دلکش پینٹنگز دیواروں پر آویزاں تھیں۔ یہ بلاشبہ فن کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔"(۶۷)

عطاء الحق قاسمی کی ایک اور خوبی ان کا وضاحتی انداز بھی ہے ۔ اس وضاحتی اسلوب سے چیزوں، عمارتوں اور شخصیات کا سیاق وسباق اور تاریخی پس منظر بھی معلوم ہو جاتا ہے اور مصنف کے تاریخی شعور اور وسعت کا بھی پتہ چلتا ہے۔اسی اسلوب سے کام لیتے ہوئے انہوں نے مغربی تہذیب کی ادبی تاریخ کو بھی بیان کیا ہے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کے روح رواں ادبی شخصیت شیکسپیئر کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کے مشاہدے میں آتا ہے کہ جو بھی سیاح برطانیہ آتے ہیں تو اس عظیم ادبی شخصیت کے گاؤں ضرور جاتے ہیں۔ جو کہ برمنگھم سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں شیکسپیئر میوزیم بھی ہے۔ جس میں موجود تصاویر اور ملبوسات اہل

مغرب کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں۔

> "برمنگھم سے قریباً ۳۵ میل کے فاصلے پر شیکسپیئر کا گاؤں ہے۔ شیکسپیئر یہاں سے تلاش روز گار میں کسی دوسرے شہر ہجرت کر گیا تھا۔ اب شیکسپیئر کی وجہ سے پورے گاؤں کو سیاحوں کی بدولت روز گار مل چکا ہے۔ گاؤں کے بیچ میں ایک نہر ہے جو ایک جھیل میں گرتی ہے۔ شیکسپیئر میوزیم جہاں شیکسپیئر کے زمانے کے ملبوسات' تصاویر' ہتھیار اور دیگر اہم نوادرات رکھے ہیں۔"(۶۸)

سفر نامہ نگار نے تاریخی شخصیات کے ساتھ تاریخی مقامات کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ وہ لندن کے مشہور ہائیڈ پارک بھی گئے۔ یہ پارک ۱۶۳۷ء میں تعمیر کیا گیا۔ یہ ۳۵۰ ایکڑ کے وسیع رقبے پر مشتمل ہے۔ یہ پارک آزادی اظہار رائے کے لیے مشہور ہے۔ یہاں ہر شعبہ ہائے زندگی اور شخصیات پر آزادانہ تنقید کی جاتی ہے۔ یہاں کلیسا' ملکہ اور مختلف شخصیات پر تنقید بھی کی جاتی ہے۔ یہ اس تہذیب کے مثبت پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔ اس پارک میں یہ اظہار آزادی شہریوں کو ۱۸۷۲ء سے حاصل ہے۔ سفر نامہ نگار نے ہائیڈ پارک کی منظر کشی یوں کی ہے۔ "یہاں سے ہم لوگ ہائیڈ پارک چلے گئے جہاں دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت پر دل کھول کر تنقید کی جاسکتی ہے بلکہ سات پشتوں کے اس کا شجرہ نسب بھی گنوایا جاسکتا ہے۔"(۶۹)

سفر نامہ نگار واقعات کے پس منظر میں موجود محرکات کو بھی دیکھتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں کو پڑھتے ہوئے دنیا کے عظیم قوموں کے عروج وزوال کی داستان ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ سفر نامہ نگار نے برطانیہ کے جن تاریخی مقامات کی سیر کی ۔ ان میں ڈسٹرکٹ لیک بھی شامل ہے۔ فطرت کی خوبصورتی بھی اس تہذیب کو دلفریب بناتی ہے۔ فطرت کے حسن نے بہت سے تاریخی شعراء کو بھی جنم دیا۔ جس سے ڈسٹرکٹ لیک کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ بریڈ فورڈ میں واقع یہ پرسکون جھیل جنت ارضی لگتی ہے۔ انگریز قوم کی نفاست پسندی کا ایک سبب یہاں کی فطرتی دلکشی بھی ہے۔ سفر نامہ نگار ڈسٹرکٹ لیک کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں۔

> "بریڈ فورڈ سے غلام قادر آزاد' حضرت شاہ' ڈاکٹر طارق اور میں ڈسٹرکٹ لیک دیکھنے نکل گئے جہاں ورڈز ورتھ کا آبائی شہر ہے۔ ڈسٹرکٹ لیک کے علاقے میں گھومتے ہوئے اندازہ ہوا کہ ورڈز ورتھ کی شاعری میں فطرت کا اتنا بے پناہ حسن اتنی خوبصورتی کے ساتھ کیسے در آیا ہے۔۔۔۔۔یوں لگتا ہے کوئی جنت ارضی ہے اور یہ سب لوگ

کسی نیک عمل کے اجر کے طور پر یہاں بھیجے گئے ہیں۔"(۷۰)

سفر نامہ نگار نے برطانیہ میں موجود تاریخی عناصر کی جو تصویر کشی کی ہے اس سے ادراک ہوتا ہے کہ ان کا تاریخی شعور پختہ اور تاریخ کے ساتھ ان کی دلچسپی گہری ہے۔ تاریخی عناصر کے بیان کے ساتھ ان کا ناقدانہ جائزہ بھی پیش کرتے ہیں۔ تاریخ کو بیان کرتے ہوئے وہ ماضی کے جھرکوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اسی خوبی کی باعث وہ ہم عصر سفر نامہ نگاروں سے منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔

ج۔ "دھنک پر قدم" اور گوروں کے دیس میں" تہذیبی عناصر کا تقابل:

تقابل عربی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی آمنے سامنے کھڑا ہونے کے ہیں اور اصطلاحی معنوں میں اس کا مطلب مقابلہ یا موازنہ کرنے کے ہیں۔ انگریزی میں تقابل کے لیے لفظ "comparison" استعمال ہوتا ہے۔ تقابلی مطالعے کی ابتدا ۱۸۲۷ء کو فرانس سے ہوئی۔ جب پروفیسر فیلیمان نے تقابلی مطالعے کی نشاندہی کی۔ برطانیہ کے پروفیسر سوزن بیسنٹ نے تقابل کی تعریف یوں کی ہے۔ "تقابل ادب محض ثقافتوں کے متون کا مطالعہ ہے۔ یہ ایک کثیر علمی مضمون ہے جو زمان اور مکان کے بعد میں پیدا ہونے والے ادب کے درمیان رشتوں کے نقوش سے متعلق ہے"(۷۱)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی ڈکشنری میں تقابل کے معنی یہ بتائے ہیں۔ "تقابل، موازنہ، مشابہت، مقابلہ، مثال، دو چیزوں کے درمیان موازنہ، خاص طور پر یہ جاننے کے لیے کہ ان میں کیا خصوصیت مماثل اور کیا غیر مماثل ہے۔"(۷۲)

تقابل دراصل مختلف متون کے مطالعے کا نام ہے۔ تقابل کرتے وقت خیال رکھا جائے کہ دو یا دو سے زیادہ چیزیں ہوں جن کا تقابل کیا جا رہا ہے۔ جن فن پاروں کا تقابل کیا جا رہا ہے ان کا تعلق ادب کی ایک ہی صنف سے ہے۔ تقابل دو مختلف زبانوں پر مشتمل فن پاروں کا بھی ہو سکتا ہے لیکن صنف ایک ہی ہو۔ پھر اس بات کو بھی مد نظر رکھا جائے کہ یہ ایک عہد کے ہوں اور ان فن پاروں میں کچھ اشتراکات اور افتراقات بھی ہوں تاکہ فن پاروں کی افادیت کا پتہ چل سکے۔

تقابلی ادب، ادب کی ایسی شاخ ہے جس میں رجحانات اور میلانات کے موازنے کی بنیاد پر دو ادبی فن پاروں کا تجزیہ ممکن ہے۔ تقابلی ادب دراصل مختلف ادبیات کے مابین ایک ایسے تعلق کا نام ہے جو ایک ہی وقت میں کئی ممالک یا ادبیات پر محیط ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ تاریخی اعتبار سے زمانوں کا احاطہ کر

سکتا ہے۔

آج تقابلی ادب کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اب یہ ایک باقاعدہ مضمون کی حیثیت سے مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھایا جا رہا ہے۔ تقابلی ادب سے نہ صرف انسانی اقدار کا جائزہ لیا جا سکتا ہے بلکہ فنون لطیفہ سے آگاہی بھی ممکن ہے۔ تقابل کی افادیت کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ کوئی بھی تحریر ہو چاہے اس کا تعلق تحقیق سے یا تنقید سے ہو، اس کا اختتام تقابل پر ہوتا ہے۔

تقابل سے مختلف علاقائی فن پاروں کو عالمی سطح پر متعارف ہونے کا موقع میسر آتا ہے۔ یعنی اس سے ایک عالمگیر معاشرے کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے۔ یہ ایسا ادب فراہم کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جو کہ جغرافیائی حدود و قیود سے پاک ہو۔ دوسری قوموں اور ملکوں کی تہذیب و ثقافت سے آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے۔ مقامی زبان و ادب کے جمود کا خاتمہ ممکن ہے۔ اس سے نہ صرف تحقیق و تنقید کا دائرہ وسیع ہوتا ہے بلکہ مختلف عہد کے اُسلوب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس سے اقوام کے درمیان رواداری کا قیام ممکن اور رویوں میں کشادگی آتی ہے۔ الغرض اس کی بین اللسانی اور بین الثقافتی اہمیت سے انکار کسی صورت ممکن نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ تقابلی ادب دو مختلف اقوام، زبانوں اور دو تہذیبوں کی علمی تنقید بھی ہے۔ مختلف اقوام عالم کے ادبیات میں ادبی تحریکوں کا تقابلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطحوں پر دوسری قوم کے اثرات کا تجزیہ بھی ممکن ہے۔

زیر نظر مقالہ میں بھی "دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں" کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں یہ اشتراکات اور افتراقات سامنے آئے ہیں۔

i. اشتراکات:

سفر نامہ نگاروں کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ میں مسلم آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور وہ اس بات پر مطمئن ہیں کہ یورپ میں بسنے والے پاکستانی اپنے مذہب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ اپنے مذہبی تہوار جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ یہ پاکستان سے آنے والے مہمانوں کو خوشدلی سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر نامے میں مختلف مقامات پر یہ اظہار کیا ہے۔ "بریڈ فورڈ میں پاکستانی خاصی تعداد میں آباد ہیں، جو کہ ساٹھ ہزار ہے اور ان کی اکثریت اپنے مذہب اور ثقافت سے پوری طرح وابستہ ہے۔۔۔۔ صوفی اسماعیل صاحب نے بتایا کہ بریڈ فورڈ میں ۶۵ مسجدیں ہیں۔"(۴۳)

دونوں سفر نامہ نگاروں نے یہ تجزیہ کیا ہے کہ مذہب سے دوری نے اس قوم کو مادہ پرست بنا دیا ہے

اور اب وہ صرف اتوار کے روز ہی گرجاگھر جاکر مذہبی عبادات بجالاتے ہیں۔

دونوں سفر نامہ نگاروں کے مشاہدے میں آتا ہے کہ برطانیہ میں ہندوستانی اور پاکستانی کثیر تعداد میں آباد ہیں چنانچہ یہاں اردو بہت زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو برطانیہ کی تیسری بڑی زبان کا درجہ پاچکی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے مختلف مقامات پر اردو کے سائن بورڈز کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس سے اردو کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ برطانیہ میں کچھ شہر ایسے ہیں کہ جہاں انگریزوں کے بجائے ہندوستانی اور پاکستانی اکثریت میں ہیں۔ تاہم عطاء الحق قاسمی اردو کے مستقبل کے حوالے سے فکر مند بھی لگتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ کچھ پاکستانی ایسے بھی ہیں جو کہ انگریزی زبان کو پسند کرتے اور بچوں کو انگریزی بولتا دیکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ مصنف انہیں اپنی زبان کے حوالے سے احساس کمتری کا شکار کہتا ہے۔"وہ اپنے بچوں کو انگریزی بولتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور خوشی سے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا کر کہتے ہیں۔ آہا! میرا بیٹا کسی انگریز کا بیٹا لگتا ہے۔"(۷۴)

دونوں سفر نامہ نگاروں کا خیال ہے کہ اہل مغرب نے آزادی کے نام پر عورت کی جتنی تذلیل کی ہے وہ دنیا کے کسی اور سماج نے شاید ہی کی ہو۔ انہوں نے ہر جگہ عورت کا تجارتی پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ بظاہر انہوں نے عورت کو سیاسی، معاشی، سماجی اور جنسی آزادی دے دی ہے لیکن اس آزادی کے نام اس کی تذلیل بھی خوب کی ہے۔ انہوں نے اس کو اشتہار کی زینت بنایا اور کاروباری لحاظ سے اس کا جائز ناجائز استعمال کیا۔

نسلی اور لسانی اعتبار سے دونوں سفر نامہ نگار سکھ قوم کو اپنی اقدار سے جڑا دیکھتے ہیں۔ سکھ ہر جگہ اپنی مخصوص تہذیب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ یہ اپنے مذہبی روایات پر عمل کرتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتے۔ یہ اپنے مخصوص لباس، چہرے پہ داڑھی، سر پر پگڑی پہنے اور اپنے منفرد انداز سے پنجابی بولتے نظر آتے ہیں۔

دونوں سفر نامہ نگاروں نے مشاہدہ کیا کہ برطانیہ میں بسنے والے ہندوؤں کی اکثریت نے مغربی تہذیب کا زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ دونوں سفر نامہ نگاروں کے مشاہدے میں یہ بات آتی ہے کہ مغربی چکاچوند زندگی نے ان کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کہتے ہیں۔

> "مغرب میں جو ایشیائی خواتین آباد ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی ہیں جنہوں نے یہاں کی تہذیب کا زیادہ اثر قبول کر لیا ہے۔ خصوصاً وہ نسل جو یہاں پیدا ہوئی اور جس نے مغربی ماحول میں پرورش پائی۔ ان کی ایک تعداد اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہنا

چاہتی اور بد قسمتی سے ہماری بھارتی خواتین میں یہ لہر بہت زیادہ ابھر کر سامنے آئی ہے۔"(۷۵)

تاریخی اعتبار سے دونوں سفر نامہ نگاروں کا شعور کافی گہرا ہے۔ تاریخی عناصر جو کہ کسی بھی تہذیب کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ دونوں نے کم و بیش ایک جیسے تاریخی عناصر کا تذکرہ کیا ہے۔ لیک ڈسٹرکٹ، برٹش میوزیم، ہائیڈ پارک، سینٹ پال گرجاگھر، برطانیہ کے عظیم تاریخی شعراء شیکسپیئر اور ورڈزورتھ کا تذکرہ اور دریائے ٹیمز کا ذکر دونوں سفر ناموں میں ملتا ہے۔

برطانیہ کے دیہی علاقوں کی خوبصورت زندگی کی عکاسی دونوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔

بیگم اختر ریاض الدین کے ہاں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہے اور دوسری طرف عطاء الحق قاسمی کے اسلوب میں طنز و مزاح اہم عنصر کے طور پر موجود ہے۔

دونوں سفر نامہ نگار منظر نگاری اور مرصع نگاری کے فن کو سمجھتے اور اس کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ "دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں" کے مطالعے سے آگاہی ہوتی ہے کہ اہل مغرب کو سیاحت کا بہت زیادہ شوق ہے اور وہ خوبصورت موسم سے لطف اندوز ہونے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے ۔ یہ فطری حسن کی دلدادہ قوم ہے۔

دونوں سفر نامہ نگاروں کے مشاہدے میں آتا ہے کہ اہل مغرب نے اپنے شہریوں کو مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی آزادیاں دی ہوئی ہیں۔ ہر ایک کو اظہار کی آزادی ہے۔ ہر شخص اپنی مرضی کا کاروبار کر سکتا ہے۔ مذہبی حوالے سے کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ ان جمہوری روایات نے دونوں سفر نامہ نگاروں کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔

دونوں سفر ناموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب میں جنس کی بنا پر امتیاز نہیں برتا جاتا۔ یہاں قانون کی بالادستی ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کو قانون سے بالاتر تصور نہیں کرتا۔ جمہوری سوچ کو پروان چڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں ریاست کی حیثیت ایک فلاحی ادارے کی سی ہے جو اپنے شہریوں کو زندگی کی تمام سہولیات فراہم کرتی ہے۔ ان کی ترقی اور خوشحالی کا راز بھی ہے۔ مغرب کی اعلیٰ جمہوری روایات سے دونوں سفر نامہ نگار متاثر ہوئے اور وہ ایسی روایات کو اپنے معاشرے میں پروان چڑھتے دیکھنا چاہتے ہیں۔

ii. افتراقات:

عطاء الحق قاسمی نے اہل مغرب کے خاندانی نظام پر بہت تنقید کی ہے۔ یہاں خاندان ٹوٹ پھوٹ کا

شکار ہے۔ مصنف یہاں کے خاندانی نظام کا تقابل اپنے وطن کے خاندانوں سے بھی کیا ہے۔ اہل یورپ اخلاقی لحاظ سے اس قدر گر چکے ہیں کہ اپنے بوڑھوں کا سہارا بننے کے بجائے ان کو اُٹھا کر اولڈ پیپل ہوم میں ڈال دیتے ہیں۔ یہاں ریاست بوڑھوں کو سینئر سٹیزن کہہ کر ان کو ساری سہولیات فراہم کرتی ہے۔ سفر نامہ نگار کو اہل مغرب کا خاندانی نظام سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ اس نظام پر کھل کر اپنے سفر نامے میں تنقید کرتے ہیں۔

> "پاکستان میں بچے عام طور پر اپنے والدین کی خدمت اور دیکھ بھال کرتے ہیں جب کہ اس کے برعکس مغرب میں بچے اپنے والدین سے غافل رہتے ہیں۔ والدین بوڑھے ہو جائیں تو یہ بچے انہیں اولڈ پیپل ہوم میں جمع کروا دیتے ہیں اور رسید حاصل کر لیتے ہیں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔"[۷۶]

جب کہ دوسری طرف بیگم اختر ریاض الدین نے صرف وہاں کے دیہی خاندانی نظام پر بات کی، جن کی مہمان نوازی اور سادہ و پر سکون زندگی ان کو بہت اچھی لگتی ہے۔

"گوروں کے دیس میں" مصنف نے اہل مغرب کے سرمایہ درانہ نظام کو ناقدانہ انداز سے دیکھا۔ بیگم اختر ریاض الدین نے سرمایہ درانہ نظام پر بات نہیں کی۔ یہاں مختلف سودی کمپنیاں شہریوں کو کریڈٹ کارڈز جاری کرتی ہیں۔ شہری ان کے ذریعے ایک مقررہ حد رقم تک خریداری کر سکتے ہیں پھر یہ لوگ ان کی ادائیگی کے لیے شب و روز محنت کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار مغرب کی شدید مادہ پرستی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور مادیت پرستی سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔

> "انسان ان مشینوں کا موبل آئل بن جاتے ہیں جنہوں نے انہیں ائر کنڈیشنڈ گھر، خوشبویات، رنگ برنگے کپڑوں اور کھانے پینے کی وافر اشیاء پر ملازم رکھا ہوا ہے۔۔۔۔ مغربی معاشرے کو آشائشوں کے لیے زندگی کی حقیقی خوشیوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔"[۷۷]

بیگم اختر ریاض الدین کے ہاں خود نمائی کے عناصر ملتے ہیں۔ آپ کے سفر نامے میں خود نمائی کا ایک یہ عنصر بھی سامنے آتا ہے۔ "سارا کنبہ معہ سامان کے آرام سے آ جاتا تھا لیکن وہاں کے سادہ لوح باشندے 'شیورلے' کے تازہ ترین ماڈل سے ناواقف تھے۔ آتے جاتے ہم سے رونمائی کرواتے۔"[۷۸] جبکہ عطاء الحق قاسمی کے ہاں خود نمائی کا عنصر نہیں ملتا۔

بیگم اختر ریاض الدین کا اسلوب قدرے مشکل ہے جس کو سمجھنے کے لیے غور و فکر کرنا پڑتا ہے جبکہ

عطاء الحق قاسمی کا اسلوب سادہ اور قابل فہم ہے۔

بیگم اختر ریاض الدین نے وہاں کے بادشاہی نظام اور سامراجیت پر بھی بات کی ہے جبکہ عطاء الحق قاسمی نے برطانیہ کے سرمایہ درانہ نظام کا بالخصوص تجزیہ کیا ہے۔

"دھنک پر قدم" میں انگریزی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ جس کو ایک وجہ یہ ہے کہ مصنفہ نے انگریزی ادب میں ماسٹر کیا ہوا ہے جبکہ "گوروں کے دیس میں" پنجابی الفاظ کا کہیں کہیں استعمال ہے۔

بیگم اختر ریاض الدین کی یہ خوبی ہے کہ تاریخی عناصر کو مختصراً بیان کرتی ہیں۔ وہ صرف ماضی کو ہاتھ لگا کر مستقبل کا رخ کرتی ہیں۔ جبکہ عطاء الحق قاسمی تاریخ کو تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی مشرقی اقدار کو پسند کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جبکہ بیگم اختر ریاض الدین کو مغربی اقدار اور نفاست اچھی لگتی ہے۔ وہ ترقی یافتہ مغرب سے اس قدر متاثر نظر آتیں ہیں کہ سفر نامے میں ایک جگہ اپنے جذبات کے اظہار اس طرح کرتی ہیں۔ "اگر کبھی جلاوطن ہوئی تو بسوں گی لندن میں۔"(۷۹)

"دھنک پر قدم" میں سفر نامہ نگار نے وہاں کی شاہی زندگی کی بھی عکاسی کی۔ وہ ملکہ کے جاہ و جلال اور ان کی روزمرہ کی زندگی کو بیان کرتی ہیں۔ کہ کس قدر برطانیہ کے لوگ اپنی ملکہ کا احترام کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار ملکہ اور اس کی شان و شوکت کی بہت زیادہ گرویدہ نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ مصنفہ نے ان کے سامراجیت کے عہد پر بھی روشنی ڈالی۔ جبکہ "گوروں کے دیس میں" شاہی نظام اور سامراجیت کے عناصر شامل نہیں ہیں۔ اختر ریاض الدین کہتی ہیں۔

> "ایک دن شام میں نے صرف دولت مشترکہ کے مصوروں اور ان کے فن کے ساتھ گزاری۔ وہاں شہزادی مارگریٹ سے ملاقات ہوئی۔ فوٹو سے کہیں زیادہ خوبصورت بوٹا قد۔ ہلکی گلابی جلد۔ بڑی آسمانی آنکھیں جن میں فانوس چمک رہے تھے۔ مجھے بہت پسند آئی۔ ملکہ کی بہن نہیں معلوم ہوتی تھیں۔"(۸۰)

"گوروں کے دیس میں" سفر نامہ نگار نے یورپ میں موجود ہم جنس پرستی اور عصمت فروشی جیسے عناصر پر سخت تنقید کی ہے۔ جبکہ "دھنک پر قدم" میں یہ عناصر نہیں ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اس کی بنیادی وجہ مغرب کے صنعتکاروں کو قرار دیتے ہیں۔ جو اپنی مصنوعات بیچنے کے لیے جنسی بے راہ روی کو خوشنما رنگوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کہتے ہے۔ "مغرب کے سرمایہ درانہ نظام کی بنیاد ہی ہوس زر پر ہے۔ وہ انسان کی فطری اور غیر فطری کمزوریوں کو مہمیز بنا دیتا ہے اور پھر اپنے شکنجے میں اس طرح لے لیتا

ہے کہ اس سے خود کو چھڑانا مشکل ہو جائے۔"(۸۱)

بیگم اختر ریاض الدین زیادہ تر اہل یورپ کے مثبت کو پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی لیکن عطاء الحق قاسمی اہل یورپ کے بہت سے منفی عناصر کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے۔ سفر نامہ نگار کہتا ہے کہ اہل مغرب کی اکثریت نسلی اور لسانی اعتبار سے اپنے آپ کو ایشیائی ممالک کے باشندوں سے بہتر اور مہذب قرار دیتے ہیں۔ ان کے ظاہری پن اور باطن میں بہت فرق ہے۔ یہ بظاہر مسکرا کر ملتے ہیں لیکن اندرون خانہ ایشیائی باشندوں کے لیے اچھے جذبات نہیں رکھتے۔ سفر نامہ ایک جگہ کہتا ہے۔

"ویسے ہمارا شمار تو پسماندہ اقوام میں ہوتا ہے، مہذب تو یہ لوگ کہلاتے ہیں! اگر یہ لوگ خود کو مہذب نہ کہلائیں تو میں انہیں کبھی غیر مہذب ہونے کا طعنہ نہ دوں۔ یہ اگر میرے غضب کو دعوت نہیں دینا چاہتے تو انہیں میری طرف سے کہہ دیں کہ یہ خود کو مہذب اور ہمیں غیر مہذب کہنا چھوڑ دیں۔"(۸۲)

بیگم اختر ریاض الدین کی سیر و سیاحت کی سر گرمیاں زیادہ تر لندن اور اس کے گرد و نواح تک محدود رہیں جبکہ عطاء الحق قاسمی برطانیہ کے اکثر شہروں اور سکاٹ لینڈ کا بھی احوال بیان کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کے مشاہدے میں آتا ہے کہ سکاٹ لینڈ کے لوگ برطانیہ سے زیادہ خوش نہیں ہیں۔ وہ بھی ان کو منافق اور بے اصول کہتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کی ملاقات سکاٹ لینڈ کے باشندے سے ہوئی جس نے اپنے جذبات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔

"ان سے زیادہ منافق اور بے اصول قوم کوئی نہیں۔ یہ ہمیں اس خندہ پیشانی سے ملتے ہیں مگر انہوں نے ہمیں پسماندہ رکھا ہے۔ تم نے لندن بھی دیکھا ہے اور گلاسکو بھی۔ کیا تمہیں فرق نظر نہیں آیا۔ پھر یہ کہتے ہیں کہ سکاٹ لینڈ برطانیہ کا حصہ ہے۔"(۸۳)

"دھنک پر قدم" میں سفر نامہ نگار نے برطانوی قوم کے جن منفی پہلوؤں کو سامنے لایا ہے۔ ان کے بقول یہ قوم جوئے کی بہت شوقین ہے یہ اکثر میلوں اور تہواروں پر جوا کھیلتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ "گوروں کے دیس میں" سفر نامہ نگار نے اس عنصر پر بات نہیں کی۔

دونوں سفر نامہ نگاروں نے اپنے انداز سے مغربی تہذیب کو پرکھ کر بیان کیا ہے۔ مجموعی طور پر دونوں نے اس تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو سامنے لا کر ان کو اپنانے کا درس دیا۔ دونوں سفر نامہ نگار اس تہذیب کے منفی عناصر کو اپنے ہاں پنپنا نہیں دیکھنا چاہتے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد دہلوی، سید، فرہنگ آصفیہ (جلد سوم)، طبع دوم، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۹۴

۲۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۶

۳۔ علی عزت بیگووچ، اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش، مترجم محمد ایوب منیر، میٹرو پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۷

۴۔ سفارش حسین رضوی، ہماری تہذیبی میراث، نیشنل پرنٹرز، نئی دہلی، ۱۹۷۰ء، ص ۲۲۳

۵۔ علی عباس جلالپوری، سید، روح عصر، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۲

۶۔ اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۶۱

۷۔ ایضاً، ص ۵۱

۸۔ ایضاً، ص ۵۲

۹۔ ایضاً، ص ۶۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۶۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۵-۶۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۷۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۷-۵۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۲-۵۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۵۹

۲۸۔ ایضاً، ص ۵۹

۲۹۔ ایضاً، ص ۵۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۷

۳۱۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۱۷

۳۲۔ اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، ص ٦٧

۳۳۔ ایضاً، ص ٦۴

۳۴۔ ایضاً، ص ۵۱

۳۵۔ ایضاً، ص ۵۲

۳۶۔ ایضاً، ص ۵۲

۳۷۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۵۱

۳۸۔ ایضاً، ص ۳۳

۳۹۔ ایضاً، ص ۵۱

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۳

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۴۶۔ ایضاً، ص ۸۴

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۴۸۔ ایضاً، ص ۸۷-۸۸

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۵۰۔ ایضاً، ص ۴۶-۴۷

۵۱۔ ایضاً، ص ۱٦۱

۵۲۔ ایضاً، ص ۳۲-۳۳

۵۳۔ ایضاً، ص ۵۴-۵۵

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۵۵۔ ایضاً، ص ۳۷

۵٦۔ ایضاً، ص ۲۳

۵۷۔ ایضاً، ص ۳۹

۵۸۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۱۷-۱۱۸

٦۰۔ ایضاً، ص ۵٦

٦۱۔ ایضاً، ص ۵۵

٦۲۔ ایضاً، ص ٦٦

٦۳۔ ایضاً، ص ۴۱

٦۴۔ ایضاً، ص ۴۲

٦۵۔ ایضاً، ص ۴۳

٦٦۔ ایضاً، ص ٦۸

٦۷۔ ایضاً، ص ٦۹

٦۸۔ ایضاً، ص ۹۵

٦۹۔ ایضاً، ص ۴۳

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۷۱۔ سوزن بیسنٹ، تقابلی ادب ایک تنقیدی جائزہ، مترجمہ عزیز احمد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۵

۷۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگلش اردو ڈکشنری، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۳۵۵

۷۳۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۱۱۱-۱۱۲

۷۴۔ ایضاً، ص ۳۹

۷۵۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۷۶۔ ایضاً، ص ۲۵

۷۷۔ ایضاً، ص ۵۰

۷۸۔ اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، ص ۷۲

۷۹۔ ایضاً، ص ۵۲

۸۰۔ ایضاً، ص ۷۷

۸۱۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۱۴۰

۸۲۔ ایضاً، ص ۴۹

۸۳۔ ایضاً، ص ۱۷۵

باب سوم:

"دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں" ثقافتی عناصر کی پیشکش

الف: "دھنک پر قدم" میں ثقافتی عناصر کی پیشکش:

i. رسم ورواج کی پیشکش:

سفر نامہ جہاں ادب، مذہب، سیاست اور تاریخ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ وہاں پر کسی معاشرے یا خطے کی ثقافت کو سمجھنے میں مناسب معلومات فراہم کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار بغیر کسی وسیلے کے ان سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے۔ ان سے معاملات طے کرتا ہے اور ان کے حالات زندگی سے بھی آگاہ ہوتا ہے وہ ان کے طرز معاشرت کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اہل مشرق کے لیے یورپ کا طرزِ معاشرت پر لطف اور دلفریب تھا۔ زمانہ قدیم سے مشرقی سیاح مغرب کی سیر کو جاتے رہے ہیں اور وہاں کے کلچر کو اپنے سفر ناموں میں سموتے رہے۔ اس طرح اردو سفر ناموں میں یورپ نامے لکھنے کی روایت پروان چڑھتی رہی۔ بہت سے پاکستانیوں نے بھی یورپ کے سفر کیے اور سفر کے حالات قلمبند کیے۔ ان سفر ناموں سے یورپ کی طرزِ معاشرت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ڈاکٹر قدسیہ اس حوالے سے کہتی ہیں۔

> "یورپ ایک ایسی زمین ہے جو اپنی مخصوص آب وہوا اور معاشرت کی وجہ سے ہمارے خطے سے مختلف ہے۔ سفر نامہ نگار بعض اوقات ان دونوں علاقوں کا تقابل بھی کرتا نظر آتا ہے۔ اہل یورپ کی فکری سطع بلند ہے۔ یہ تحقیقی سوچ رکھنے والا معاشرہ ہے۔ اس تغیّر پذیر معاشرے میں نہ صرف لوگوں کے حقوق محفوظ ہیں بلکہ آزادی اظہار رائے بھی ہے۔"(۱)

ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں۔

> "ترقی کے لیے کسی بھی معاشرے میں ضروری عنصر تبدیلی کا ہے۔کچھ معاشرے ایسے ہیں جو تبدیلی کے عمل کی مزاحمت کرتے ہیں لیکن جہاں اس عمل کو تسلیم کر لیا جائے وہاں معاشرہ آگے بڑھتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے معاشرے میں تبدیلی کو قبول کرنے اور پھر نئے حالات میں خود کو ڈھالنے کی صلاحیت ہے۔"(۲)

بیگم ختر ریاض الدین نے اپنے سفر نامے "دھنک پر قدم" میں مغربی تہذیب و ثقافت کو اجاگر

کیا ہے۔ وہ مغربی معاشرے کے لباس، کھانوں اور اشیاء کی ہر قسم اور ہر منظر کو عمدہ انداز سے بیان کرتی ہیں۔ وہ افراد کے رہن سہن اور زندگی کے معاملات کو معاشرے کے اجتماعی مزاج اور کردار میں دیکھتی ہیں۔ انہیں انسانی نفسیات پر مکمل عبور ہے۔ انہوں نے برطانیہ کی سماجی اور تہذیبی زندگی کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ وہ اختصار کے ساتھ زیادہ معلومات فراہم کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کی تحریریں مغربی معاشرے کی ثقافت کی بھرپور عکاس ہیں۔

برطانوی معاشرت میں رسم ورواج کی اہم ہونے کا اس بات سے بھی ادراک ہوتا ہے کہ برطانیہ کا تین چوتھائی آئین بھی رسم ورواج اور روایات پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ اپنی روایات کا حد درجہ احترام کرتے اور اُن سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ رسم ورواج سے گہرا لگاؤ اب ان کی ثقافت کا حصہ بن چکا ہے۔ مصنفہ برطانوی آئین اور شہری آزادی کا تذکرہ یوں کرتی ہیں۔ "یہ لندن غیر نوشتہ آئین کا علمبردار۔ یونان کے بعد دنیا کی سب سے پرانی شہری آزادی کی حمایت۔"(۳)

ہر خطے کی اپنی مخصوص ثقافت ہوتی ہے جو کہ اُسے دوسرے خطوں سے ممتاز کرتی ہے۔ برطانیہ کا شاہی خاندان اور امراء کا طبقہ شاہانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ ان کا رہن سہن منفرد ہونے کے ساتھ پُرکشش بھی ہوتا ہے۔ یہ بڑے بڑے شاہی محلات میں عیش و عشرت سے رہتے ہیں۔ مصنفہ بڑے طبقے کی فرد ہونے کی ناطے سے ان کے ہاں مغربی فضا خاصی نمایاں ہے۔ اہل مغرب کی شاہانہ طرزِ زندگی ان کو بہت بھاتی ہے اور وہ اپنے سفر نامے میں ان کے شاہانہ طرز معاشرت کی عکاسی اس طرح کرتی ہیں۔

> "یہ محل ونڈسر کاسل کے بالکل قریب آٹھ ایکڑوں میں بسا ہوا ہے۔ دو نہانے کے تالاب۔ چار ٹینس کورٹ۔ شجرستان۔ خود محل کے اکیس کمرے سب سجے سجائے۔ ایرانی قالین۔ بلّوریں جھاڑ فانوس نقرئی گلدان لیکن ساری فضا پر ایک حسرت برس رہی تھی۔ ایک ہوک سے اُٹھی۔"(۴)

ہر قوم کا ایک اپنا مخصوص مزاج ہوتا ہے جو اس کی شناخت کا وسیلہ بنتا ہے اور یہی مزاج قوموں کی ترقی و بقا میں معاونت کرتا ہے۔ اہل مغرب کی ثقافت کی اہم خوبی یہ بھی ہے کہ یہ تقریبات اور تہواروں کا اہتمام بہت سلیقے سے کرتے ہیں۔ یہ اپنی روایات کو ہر صورت اپنانے کی سعی کرتے ہیں۔ روایات سے لگاؤ کی ایک مثال ان کی ملکہ سے والہانہ عقیدت ہے۔ یہ ملکہ کو اتحاد کی علامت سمجھتے ہیں۔ ملکہ کی بہت زیادہ عزت و تکریم ان کی روایت پسندی کو ظاہر کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار کہتی ہیں۔ "اتنے میں بینڈ بجا اور ملکہ کی آمد کے لیے

چوبداروں نے راستے بنانے شروع کیے مہمان پلے پڑ رہے تھے زیارت کے لیے، محل کے ڈپٹی نے ان کو ہٹاہٹا کر قطاریں لگوائیں۔ تاکہ ملکہ ہر ایک کو ذرا ذرا مسکراہٹ بانٹ سکے۔"(۵)

سفر نامہ نگار بعض مقامات پر برطانوی طرزِ معاشرت کا ہندوستانی معاشرت سے تقابل کرتی بھی نظر آتی ہیں۔ برطانوی قوم جو کبھی مرچ مصالحوں سے بہت پرہیز کرتی تھی اب اس کی عادی بن چکی ہے۔ اب ہندوستان کی معاشرت برطانوی معاشرت پر غالب آگئی۔ ہندوستان میں قیام کے دوران وہ آہستہ آہستہ مقامی کھانوں کے عادی ہو گئے۔ اختر ریاض الدین کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اب لندن کے مختلف ریستورانوں میں مصالحے دار اور چٹ پٹے کھانوں کی خوشبو آتی ہے۔ یہاں برطانوی قوم نے ہندوستان میں قیام کے دوران اپنی ثقافت کے اثرات چھوڑے ہیں وہیں وہ ہندوستان کی ثقافت کے اثرات لیے بغیر نہ رہ سکی۔

"لندن جاکر ایک بات سمجھ نہ آئی کہ وہ برطانوی قوم جو ہندوستان میں دو صدی رہ کر بھی مرچ مسالوں سے پرہیز کرتی تھی، ہند کو آزادی دیتے ہی اس قدر دیسی کھانوں کی متوالی کیسے ہوگئی؟ لندن میں اپنے کھانے پکانے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ چپے چپے سے قورمے پلاؤ کی مہک آتی تھی۔ ہماری غذائی کلچر نے وہاں چین کو بھی مات دے دی۔ ساٹھ سے اوپر سو دیشی ریستوران ہر وقت کھچاکھچ (زیادہ تر سفید فام باشندوں سے) بھرے ہوتے ہیں جن میں عموماً بنگالی خانساماں اپنے کمالات دکھاتے ہیں۔ لندن میں کیا نہیں ملتا؟ دلّی کی لذیذ ترین چاٹ کا مسالہ ڈبوں میں۔ سُوکھی سُرخ مرچ کا اچار۔ الفانسو آم۔ بنگال کے جلاجوگا رس گلے، سبھی نعمتیں ہیں۔"(۶)

لندن کے گرد و نواح میں رہنے والے دیہاتی بہت زیادہ مہمان نواز ہیں۔ مصنفہ نے اپنے سفر کے دوران برطانیہ کے دیہاتی علاقوں کا بھی رُخ کیا اور اُن کے طرزِ زندگی کو پرکھا۔ وہ ان دیہاتیوں کی زندگی، مہمان نوازی اور عمدہ اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ موسم گرما میں جب سیاحوں کی اکثریت ان علاقوں کا رُخ کرتی ہے تو یہ دیہاتی ان کا استقبال کرتے نظر آتے ہیں اور مختلف طرح کی سہولتیں مناسب داموں فراہم کرتے ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں کے لوگ بھی سیاحوں کا اسی طرح پرتپاک استقبال کرتے ہیں۔ برطانیہ کے دیہاتی لوگ بھی پاکستانی دیہاتیوں کی طرح سادہ اور پُرسکون زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ مہمانوں کو گھر جیسا ماحول فراہم کر کے نہ صرف سیاحت کو فروغ دیتے ہیں بلکہ اپنی ثقافت کو بھی پروان چڑھا رہے ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں بھی اسی طرح کی سہولیات سے سیاحت کا فروغ ممکن ہے۔ جس سے

ایک طرف ملک کے زرِ مبادلہ میں اضافہ ہو گا اس کے ساتھ یہاں کی تہذیب و ثقافت کو بھی پھیلنے پھولنے کا موقع میسر آئے گا۔

"ہم نے اس تمام سفر میں ایک عہد کیا تھا کہ ہوٹل میں ہر گز نہ ٹھہریں گے۔ چاہے کتنا سستا ہو۔ اس علاقے کے لوگ بہت مہمان نواز اور خلیق وسادہ سچے انسان ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں جب سیاح شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنا کر نکلتے ہیں تو یہ لوگ اپنے گھر کے در وا کر دیتے ہیں صرف چھ سات شلنگ فی کس میں اچھے خاصے کمرے اور گرم گرم صبح کا ناشتہ دیتے ہیں۔ اور پھر یہ جگہ ہوٹل کی مصنوعی گھٹن سے پاک ہے۔"(۷)

اہل مغرب دنیا میں سب سے زیادہ فیشن زدہ ہیں۔ مصنفہ نے مغربی معاشرے کے ملبوسات کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یہاں دنیا کے قیمتی سے قیمتی ملبوسات استعمال کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً خواتین خوش لباسی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن اس عریاں لباس نے برطانوی سماج میں جنسی رجحان کو فروغ دیا ہے۔ فیشن نے اخلاقی قدروں کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔ جنس زدہ نوجوان سڑکوں پر بے مقصد گھومتے نظر آتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کہتی ہیں۔

"راجہ صاحب ہم کو دنیا کے سب سے زیادہ فیشن زدہ ریس کورس 'ایسکٹ' پر بھی لے گئے۔ یہاں ہجوم کم نازوانداز زیادہ۔ ایک سے ایک حسین نازنین یورپ کے انمول لباس میں تیتری سے ہلکی چھڑی لگائے سامنے سے مٹکتی گزر جاتی تھیں۔ راجہ صاحب پہلی دفعہ گھوڑوں کو بھول کر ان غزالانِ رعنا کی دید میں مست ہو گئے۔"(۸)

اہل مغرب کی ثقافت ایک آفاقی ثقافت کا درجہ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ یہاں ان کی دیگر بہت سی شناختیں ہیں وہاں ان کو کُتب بینی کا بہت زیادہ شوق ہے۔ ایک کتاب کا لاکھ دو لاکھ کا ایڈیشن چھپتے ہی بک جاتا ہے۔ اسی سبب یہاں بہت سی لائبریریاں قائم ہیں۔ یہاں سے دن بھر میں ہزاروں مرد و خواتین کتب پڑھنے کے لیے لے کر جاتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن ہو یا کوئی اور پبلک مقام یہ ہر وقت کتاب کو ساتھ رکھتے اور اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ ہر عمر کا شخص کتاب پڑھنے کا شائق نظر آتا ہے۔ کتب بینی کا کلچر ان کے خون میں شامل ہو گیا ہے۔ دنیا کا بڑا کتب خانہ یعنی برٹش میوزیم کی لائبریری بھی اسی ملک میں ہے۔ اس قوم کی ترقی کا راز کتاب ہی ہے۔ کتاب سے محبت نے انہیں دنیا کی مہذب قوم بنا دیا ہے۔

تھیٹر برطانوی ثقافت کا لازمی حصہ بن چکے ہیں۔ فنکار کسی بھی قوم کی ثقافت کو استحکام اور فروغ دینے میں بہت زیادہ معاون ہوتے ہیں۔ تفریح کے ساتھ ساتھ یہ ثقافت کی مختلف جزئیات کو اگلی نسلوں تک منتقل کرتے ہیں۔ برطانیہ کی ثقافتی زندگی میں تھیٹر کو اہم مقام حاصل ہو چکا ہے۔ تھیٹر کسی بھی سماج کے بھرپور عکاس ہوتے ہیں۔ یہاں مشہور ادیبوں کے ڈراموں کو سٹیج پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں فنکار اپنی پرفارمنس کے ساتھ زبان، تاریخ اور اقدار و روایات کو مخصوص انداز میں ناظرین تک پہنچاتے ہیں۔ سفر نامہ نگار برطانیہ کے سٹیج ڈراموں کی منظر کشی اس طرح کرتی ہیں۔

> "ایک سادی شام سرجون گیل گوڈ کے ساتھ گزاری۔ شیکسپیئر کے مختلف المیہ۔ مزاحیہ تفریحی ڈراموں اور نظموں کی اس شخصیت نے تین گھنٹوں پر تن تنہا پیش کیا۔ ہر دفعہ مختلف انداز میں مختلف کرداروں کی جس طرح شیکسپیئر نے صفحہ پر تشکیل دیا۔ یہ محض آواز اور ادائیگی سے پیش کرتا تھا۔"(۹)

الغرض سفر نامہ نگار کو برطانوی رسم و رواج بہت زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ خاص طور پر یہاں پیش کیے جانے والے تھیٹر سے بہت لطف اندوز ہوئیں۔ وہ ان ثقافتی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر دل سے سراہتی بھی ہیں۔ نفاست سے بھرپور طرز معاشرت سے وہ اس قدر متاثر ہیں کہ اس معاشرے میں ہمیشہ رہنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔

ii. تہواروں اور میلوں کی پیشکش:

صنعتی ترقی کی وجہ ثقافتی انتشار کا خطرہ ہوتا ہے اس انتشار کی وجہ سے قومی اقدار و روایات کے مٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں میلوں اور تہواروں کا سرکاری سطح پر انعقاد کر کے قومی ثقافت کو مٹنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ میلے اور تہوار کسی بھی خطے کی ثقافت کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ صحت مندانہ سرگرمیوں کو فروغ دیتے ہیں۔ برطانیہ کے میلوں کی اہم خصوصیت سرکاری سرپرستی ہے۔ سرکاری سرپرستی میں میلوں کے انعقاد سے نہ صرف سیاحت کے میدان میں ترقی لائی جا سکتی ہے بلکہ اس خطے کی ثقافت کو عالمی سطع پر متعارف بھی کرایا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی اور امن و امان نہ ہونے کی وجہ سے میلوں کا انعقاد معدوم ہو چکا ہے۔ تاہم اب حالات بدل رہے ہیں۔ سرکاری سرپرستی میں میلوں کو فروغ دے کر نہ صرف بہت سا زرِ مبادلہ کمایا جا سکتا ہے بلکہ اپنے کلچر کو بھی فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ میلے شہریوں کو روزمرہ کی مصروف زندگی سے باہر لا کر تسکین اور تفریح کا باعث بھی بنتے ہیں۔ میلے نہ صرف بڑوں کے

لیے کشش کا باعث بنتے ہیں اس کے ساتھ بچوں کی دلچسپی کا ذریعہ بھی ہیں۔ وہ میلوں میں شامل ہو کر بھرپور لطف اُٹھاتے ہیں۔ میلے اور تہوار کسی بھی خطے کی طرزِ زندگی کا بھرپور عکس ہوتے ہیں۔

بیگم اختر ریاض الدین نے اپنے سفر برطانیہ کے دوران وہاں کے تہواروں اور میلوں کا دلچسپی اور انہماک سے مشاہدہ کیا۔ وہ خود بھی تہواروں اور میلوں کی دلدادہ لگتی ہیں۔ انہوں نے اپنے سفر کے دوران بہت سے تہواروں اور میلوں میں شرکت کی اور لطف اُٹھایا۔ وہ لندن کے ہر تھیٹر اور میلے میں شریک ہوئیں۔ مصنفہ نے برطانیہ کی اس پُر رونق زندگی کا اپنے سفر نامے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

" وہاں دیہاتی میلہ تھا۔۔۔ گھومتے گھوڑوں پر بیٹھے۔ مشینی جوُا کھیلا۔ جس میں راجہ صاحب پیش پیش تھے۔ پھر نشانہ بازی کا سٹال آیا۔ پانچ نشانوں میں اگر سب مصنوعی خرگوش اُڑ جائیں تو انعام۔ راجہ صاحب کے دو خطا ہوئے۔ ریاض صاحب کا ایک، میرے پانچوں خرگوش کھا گئے۔ دونوں مرد کچے ثابت ہوئے۔ جتنا وہ بات اُڑانا چاہیں میں اتنا ہی چڑاؤں۔ جب انعام میں "شیونگ کریم" نکلی تو پھر میری شامت آئی۔ "(۱۰)

اہل مغرب فطری حسن کے بہت زیادہ پجاری لگتے ہیں۔ جن کے ذوق کا اندازہ مخصوص اور دلفریب سرگرمیوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ فطری حُسن سے شدید لگاؤ نے ان کو نفیس قوم بنا دیا ہے۔ مغرب میں فطری حسن ہر جگہ بکھرا نظر آتا ہے۔ یہاں مختلف انواع کے نہ صرف ہزاروں پھول لگائے جاتے ہیں بلکہ ان کی نمائش کا خصوصی طور پر اہتمام ہوتا ہے۔ اس طرح کی نمائش کے انعقاد سے نہ صرف تفریحی سرگرمی کا موقع ملتا ہے بلکہ فطرت کی رنگینیوں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مصنفہ نے اپنے سفر نامے میں ایک پھولوں کی ایک نمائش کا ذکر یوں کیا ہے۔

"لندن میں پھولوں کی ایک مخصوص نمائش CHELSEA FLOWER ہوتی ہے۔ اس کے ٹکٹ سال بھر پہلے بک جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ایڈمرل گرینٹ کی نیم فرانسیسی بیوی جوڈی، جو میرے مشاغل سے واقف تھی اس نے اپنے میاں کے ٹکٹ پر مدعو کیا۔۔۔ جب ہم نمائش میں داخل ہوئے۔ بلاشبہ یہ بین الاقوامی پھولوں میں اوّلین تھی۔ ہر ملک نے اپنے سٹال سجائے تھے۔ افریقہ، یورپ، ایشیا کا کوئی پھول ہو گا جو نہ پہنچا ہو، سویٹ پنیر کی ۳۳ قسمیں، گلاب کی ۱۱۵۔ کاسنی گلاب اور سیاہ گلاب میں نے پہلی دفعہ وہاں دیکھے۔ میرے مولا نے اس مشتِ خاک میں کیا کیا تاثیریں

پنہاں رکھی ہیں۔"(۱۱)

لندن ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ یہاں آئے روز کوئی نہ کوئی میلہ یا نمائش منعقد ہوتی رہتی ہے۔ بہت سے میلوں اور نمائشوں کا انعقاد سرکاری طور پر ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ وہ جوش و خروش سے ان میں شریک ہوتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ یہ سرگرمیاں نہ صرف سیر و تفریح کا باعث ہیں بلکہ اس سے قومی ثقافت کو پروان چڑھانے کا موقع میسر آتا ہے۔ برطانیہ میں ڈاربی ریس بھی ایک اہم ثقافتی سرگرمی ہے۔ جس میں گھوڑوں کی ریس کا انعقاد ہوتا ہے اور اس میں ملک بھر سے لوگ آتے ہیں۔ سفر نامہ نگار ڈاربی ریس کی منظر کشی اس طرح کرتی ہیں۔

"اب ڈاربی کی ریس آرہی تھی۔ راجہ صاحب نے ہم سب کو تیار کر کے ٹکٹ بھی لے لیے تھے۔ اس ریس میں چرچل کا بھی گھوڑا تھا۔ ریاض کا قیاس تھا کہ چرچل بڑا خوش قسمت انسان تھا۔ اس کا گھوڑا ضرور جیتے گا۔ آپ نے چھ شلنگ لگا دیے۔ غریب ریس کے پہلے فرلانگ میں ہی لنگڑا ہو گیا اور اس کو گولی مار دی گئی۔۔۔۔ بہر حال ڈاربی کیا تھی، ایک میلہ تھا۔۔۔۔ ہر ادارہ ہر دفتر اپنی اپنی بسیں اور ٹرکس پر اپنے جھنڈے لگا کر آیا ہوا تھا۔ شاہی باکس الگ تھا جس میں برطانیہ کا سارا نیلا خون منجمند تھا۔ ملکہ الزبتھ سب سے زیادہ محظوظ ہو رہی تھیں۔ ہر دوڑ میں کٹہرے سے آدھی آدھی باہر نکل کر تالیاں بجاتی تھیں۔"(۱۲)

آتش بازی بھی مغربی ثقافت کا نمایاں حصہ بن چکی ہے۔ مختلف میلوں اور تہواروں اور خاص طور پر نئے سال کی آمد کے موقع پر آتش بازی کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ یہ اہل مغرب کے لیے تفریح اور تسکین قلب کا عمدہ ذریعہ ہے۔ یہ اس تفریح پر لاکھوں ڈالرز لٹا دیتے ہیں۔ مصنفہ کہتی ہیں۔ "شام کو ذرہ تازہ دم ہو کر چائے پی کر باہر نکلے، تو قریب ہی ایک گاؤں میں آتش بازیاں جھوٹ رہی تھیں۔ ہم ٹہلتے ٹہلتے وہاں پہنچے۔ وہاں دیہاتی میلہ تھا۔"(۱۳)

لندن میں کھانوں کی نمائش بھی منعقد ہوتی ہے۔ جس میں مختلف ممالک کے ذائقہ دار اور مشہور کھانوں کے اسٹالز لگائے جاتے ہیں۔ یہ بین الاقوامی نمائش مختلف ثقافتوں کو قریب لانے کے ساتھ انہیں سمجھنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ مصنفہ کہتی ہیں۔ "بین الاقوامی کھانے کی نمائش ۶۵ سٹالوں پر ہر ملک کے اپنے اپنے مخصوص و معروف طعام۔ اس کے نسخے مفت ملتے تھے۔ چکھتے چکھتے پیٹ بھر جاتا تھا۔"(۱۴)

برطانیہ یہاں دیگر نمائشوں کا انعقاد ہوتا ہے وہیں طرز تعمیرات کی عکاسی کے لیے گھروں کی نمائش کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس میں بہتر (۷۲) بہترین گھروں کا انتخاب کیا جاتا اور ان کی نمائش ہوتی ہے۔ یہ نہ صرف فن تعمیر کو پرکھنے میں مدد دیتے بلکہ گھروں کی زیبائش و آرائش کو سیکھنے کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس کی منظر کشی مصنفہ نے یوں کی ہے۔ "بہتر گھروں کی نمائش، دنیا بھر کے خانہ آراء نے اپنے اپنے ملک کے تازہ ترین طرز زیبائش کا مظاہرہ کیا تھا۔"(۱۵)

برطانیہ میں پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد رہائش پذیر ہے۔ یہ لوگ اپنے وطن سے دور رہتے ہوئے بھی اپنی مذہبی اور ثقافتی تقاریب کو خصوصی اہتمام کے ساتھ منعقد کرتے ہیں۔ یہ تقریبات دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ ہم اپنے وطن میں اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ تہوار منارہے ہیں۔ مذہبی تہوار یعنی عید کا تہوار خاص طور پر مذہبی جوش و جذبے سے مناتے ہیں۔ دیگر تہواروں کے موقع پر بھی اپنی ثقافت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ تقاریب اور تہوار ان کو اپنے مذہب اور ثقافت سے جُڑا رہنے کا اچھا موقع فراہم کرتے ہیں۔

iii. رہن سہن اور سماجی روابط و آداب:

رہن سہن اور معاملاتِ زندگی کسی بھی سماج کا مجموعی عکس ہوتے ہیں۔ بیگم اختر ریاض الدین نے اپنے سفر برطانیہ کے دوران وہاں کے شہریوں کے رہن سہن اور اُن کے سماجی زندگی کو دیکھا۔ وہ انسانوں اور مناظر کو اپنے منفرد انداز سے دیکھتی اور اختصار کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ وہ رہن سہن اور دیگر معاملات کو عمدگی سے پیش کرتی ہیں۔ وہ انگریزی تہذیب و ثقافت سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔ انہوں نے وہاں کے باشندوں کے طرزِ زندگی کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ اہل مغرب کے مکانات صاف ستھرے اور آراستہ ہیں۔ اُن کے لباس اور عادات و اطوار کا ڈھنگ اعلیٰ ہے۔ پھر اس خطے کے لوگ محنتی اور کسی کام کو عار نہ سمجھنے والے ہیں۔

خوبصورت باغات لندن کی دلکشی کو مزید چار چاند لگا دیتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کی خوشحالی اور نفاست پسندی کا اندازہ باغات کو دیکھ کر بھی ہوتا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اہل مغرب کو باغبانی سے شدید لگاؤ اور عشق ہے۔ مغرب میں شہری زندگی پُر رونق اور مصروف ہے۔ اسی قدر اُن کی دیہاتی زندگی پُر لطف اور کشش کا باعث ہے۔ مصنفہ کے مشاہدے میں آتا ہے کہ یہاں پھولوں کی بے شمار اقسام ہیں۔ ان خوبصورت پھولوں نے اس خطے کی خوبصورتی میں بہت اضافہ کیا۔ مختلف انواع کے پھول اس علاقے کے لوگوں کے ذوق، نفاست اور محنتی ہونے کی بھرپور طریقے سے ترجمانی کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار نے انگلستان

کی منظر کشی بھی عمدگی سے کی ہے۔ ان کی دلفریب منظر کشی سے قاری خود کو ان پہاڑوں اور وادیوں کے درمیان پاتا ہے۔ اہل مغرب ایک طرف ان دلکش علاقوں کے سیاحت کے قابل بنا کر بہت سازرِ مبادلہ کما رہے ہیں تو دوسری طرف اپنی ثقافت کو بھی دنیا بھر میں پہنچا رہے ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں کا قدرتی حسن اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر حکومت ان علاقوں کی طرف مناسب توجہ دے تو اِن کا شمار دنیا کے خوبصورت سیاحتی مقامات میں ہو گا۔ سفر نامہ نگار اکثر اوقات معنی خیز جملے کہہ کر قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہیں۔ مزاح کی آمیزش سے وہ تلخ بات کو بھی خوبصورتی سے بیان کرنے کی قدرت رکھتی ہیں۔

> "لندن کی دخانی سڑکیں چھوڑ کر دس میل پار کرتے ہی اس کی دیہی گردونواح شروع ہو جاتے ہیں۔ جس کے لیے وہ مشہور ہے اور انگریزوں کو باغبانی سے عشق ہے۔ تھکے ہارے دفتروں سے آکر وہ باڑیں کاٹنا بیج بونا شروع کر دیتے ہیں۔ باغبانی ایک صلح کُل مشغلہ ہے۔ ازدواجی تنازعات سے بچائے رکھتا ہے۔ بیوی کی ناک یا چٹیا کاٹنے سے اچھا ہے کہ باڑ کاٹتے رہو۔"(۱۶)

نسوانی نظر مردانہ نگاہ کے برعکس زیادہ جمال پرست ہوتی ہے۔ چنانچہ مصنفہ ہر چیز میں جمال و خوبصورتی کو تلاش کرتی ہیں۔ انہیں مغرب کا فطری حسن بہت متاثر کرتا ہے اور وہ اپنے سفر نامے میں ایک جگہ اس کی منظر کشی یوں بیان کرتی ہیں۔

> "ایک طرف انگلستان کے بلند ترین پہاڑ جن پر دُور دُور برف کی سفید شہادتیں نظر آتیں ہیں اور اشجار سے ڈھکے ہوئے۔ چھوٹی بڑی سو سے اُوپر جھیلیں۔ جن کے شفاف پانی میں اپنا چہرہ دیکھ کر میک اپ کرنے کو جی چاہے۔ ہزار ہا اقسام کے خودرو پودے، پھول بوٹے۔ جگہ جگہ نوکیلی گھاٹیاں۔ پوشیدہ وادیاں۔ جہاں انسان کم اور گلاب زیادہ۔"(۱۷)

مصنفہ نے دوران سفر مغرب کی سماجی زندگی کا اچھی طرح سے مشاہدہ کیا۔ وہ اپنے سفر نامے میں اس کا برملا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔ آپ نے مغربی سماج کے کچھ پہلوؤں پر تنقید بھی کی ہے۔ وہ اس معاشرے کے مثبت عناصر کو سراہتی بھی ہیں۔ یہ لوگ اپنی زندگی کے تمام اُمور کو سلیقے سے انجام دیتے ہیں۔ یہ اپنی اقدار و روایات کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ علوم و فنون حاصل کرنے کے بعد ان کا شمار مہذب قوموں میں ہوتا ہے۔ مصنفہ نے اُن کی جو مثبت اقدار دیکھیں۔ انہی میں ایک قطار بندی ہے۔ جس کا اظہار مختلف پبلک

مقامات پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے قطار بندی کو اتنی فوقیت دی ہے کہ اب یہ چیز ان کی ثقافت کا لازمی جزو بن چکی ہے۔ بس سٹاپ ہو یا ریلوے اسٹیشن، سٹور ہو یا کلب یہ ہر جگہ مہذب طریقے سے قطار بنائے کھڑے ہوں گے۔ بیگم اختر ریاض الدین کہتی ہیں۔

"برطانیہ کی جوان ملکہ جو ابھی زچگی سے اُٹھی تھیں داخل ہوئیں۔۔۔ انگریز اس شاہی چہرے کی زیارت کے لیے دو دن پہلے قطاریں لگانا شروع کر دیتے ہے۔۔۔۔ پچھلی جنگ عظیم میں ہر چیز کے لیے قطار لگاتے لگاتے اب یہ مجبوری ایک قومی شغل بن گئی ہے۔"(۱۸)

مغرب جسے تہذیب کو گھوارہ سمجھا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار نے بظاہر مہذب نظر آنے والے معاشرے کے گھناؤنے پہلوؤں سے پردہ بھی اٹھایا ہے کہ مادی خواہشات اور جنس پرستی کو اس سماج میں بہت پذیرائی ملی ہے اب اس عفریت نے ان کو اپنی قید میں لے لیا ہے۔ مغربی معاشرے کی رگوں میں پھیلتا ہوا یہ اخلاقی زوال انھیں تباہی کی طرف لے کے جا رہا ہے۔ مصنفہ نے معاشرے کی مسخ ہوتی ہوئی اخلاقی اقدار پر مغربی سماج کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ وہ اپنے سفر نامے میں مختلف مقامات پر مغرب کی جنس نگاری پر تنقید کرتی ہیں۔ وہ اخلاق باختگی پر واضح طنز بھی کرتی ہیں۔ صنعتی انقلاب اور بے جا آزادیوں نے اس معاشرے کی اخلاقی قدروں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ جس سے اعلیٰ اقدار دم توڑتی نظر آتی ہیں۔ مصنفہ مغربی معاشرے کی جنس نگاری کی تصویر اس طرح پیش کرتی ہیں۔ "دائیں طرف وہ بدنام کونہ جہاں فرنگی طوائفیں راہ چلتوں کو شہ دیتی ہیں۔ شام کو میرے میاں مجھ سے دس قدم آگے چلتے تھے کہ ان مومی مورتیوں کو علم نہ جائے کہ وہ بقید نکاح ہیں، پھر مجھے اُن کے چٹپٹے جملے سُناتے تھے۔"(۱۹)

برطانوی طرزِ معاشرت کی ایک اہم خصوصیت یہاں کے لوگوں کو اظہار رائے کی مکمل آزادی ہے۔ یہ لوگ جمہوریت پسند ہیں۔ ہر شخص اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتا ہے۔ ہر شخص کو قانون کی نظر میں برابری حاصل ہے۔ جنس کی بنیاد کسی طرح کا امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ شہریوں کے جذبات و احساسات کی قدر کی جاتی ہے۔ علوم و فنون حاصل کر کے انہیں اپنی آزادیوں اور حقوق کا ادراک ہوا ہے۔ سفر نامہ نگار نے اس کی عکاسی یوں کرتی ہیں۔

"ہائیڈ پارک میں اگر ٹہلنے نکلتے تو جگہ جگہ بھانت بھانت کے مقرر پیٹی الٹ کر تقریر کر رہے تھے۔۔۔۔۔ تیسری صدا آئی، ہمارا شاہی خاندان شاہی بیماریوں سے پُر ہے۔

ہماری ملکہ خود سنکی ہے۔ اس کا باپ شاہی دزد تھا لیکن ماں کسی بنئے کا خون تھا، اس کا میاں اپنی سالی پر عاشق ہے۔۔۔میں نے سوچا۔ پاس کھڑا سپاہی اب صبر نہیں کرے گا۔ مقرر کو ضرور پکڑے گا۔ لیکن توبہ کرو۔ بلکہ جب ایک شہنشاہیت کے شیدائی نے مقرر پر حملہ کیا تو سپاہی نے حملہ آور کو پکڑ لیا۔ یہ ہے آزادی کا اصل رُوپ اور اصل جمہوریت!"(۲۰)

سفر نامہ نگار نے اہل مغرب کے رہن سہن اور طرزِ معاشرت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ایک وقت تھا کہ اہل یورپ کے گھروں میں غُسل خانے نہ ہونے کے برابر تھے اور یہ لوگ غسل کے اتنے دلدادہ بھی نہ تھے۔ لیکن اب یہاں ہر گھر میں غسل خانے کی سہولت موجود ہے۔ بڑے شہروں میں گھر عام طور پر تنگ و تاریک ہونے کے باوجود صاف ستھرے اور نفاست سے بنے ہوئے ہیں۔ مصنفہ کہتی ہیں۔ "اس لندن کے عین دھڑکتے دل 'ماربل آرچ' میں ایک فلیٹ لیا جس میں غل و غوغا غائب اور غسل خانے تین۔ مغرب میں اس سے بڑی جنت اور کیا مل سکتی ہے۔"(۲۱)

اہل مغرب نے ایک طرف ترقی کر کے دنیا میں اپنا نام منوایا ہے وہیں یہ قوم مادیت پرستی کا شکار نظر آتی ہے۔ اخلاقی روایات اکثر مقامات پر دم توڑتی نظر آتی ہیں۔ یہ قوم یہاں بے راہ روی کا شکار ہے اس کے ساتھ ساتھ جوئے کی انتہا درجہ کی شوقین ہے۔ جوئے کی لت ان کے خون میں رچ بس گئی ہے۔ مختلف تہواروں اور میلوں میں یہ لوگ جوئے کا خصوصاً اہتمام کرتے ہیں، جس میں معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ حصہ لیتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کسی منجھے ہوئے نقاد کی طرح ہنسی ہنسی اور شگفتہ اسلوب کے ذریعے اکثر تلخ حقائق کو بیان کر جاتی ہیں۔

"راجہ صاحب کی بدولت سارے جوئے خانے بھی جھانکے۔ ایک 'سلور سٹی' (جوا خانہ) پسند آیا جہاں شکاری کتوں کی ریس ہوتی ہے۔ آپ کو جو لمبی تھوتھنی پسند ہو پیسے لگا دیجیے۔ ہم نے بالائی نشتوں پر میز الگ کروالی اور وہیں ڈنر بھی منگوا لیا۔ کھاتے جا رہے ہیں اور ویٹر ہماری طرف سے ٹکٹ خریدتا جا رہا ہے۔ اس ٹھاٹھ سے ہم نے جوّا کھیلا ہو گا۔ کتے گھوڑوں سے بھی زیادہ چنچل اور سبک رفتار تھے کبھی راجہ صاحب کا کتا ہارتا تھا کبھی ہمارا۔ غرضیکہ اچھا خاصا لطف رہا۔ چند شلنگ ادھر یا اُدھر۔ ریس کورس چاروں طرف بھرا ہوا تھا۔ انگریز قوم جوئے کی بڑی دھتیا ہے۔ کچھ نہیں تو کتوں پر ہی شرط

لگاتی رہتی ہے۔"(۲۲)

انگلستان کا موسم انتہائی دلفریب اور اکثر ابر آلود رہتا ہے۔ یہاں کسی بھی وقت بارش شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں کے لوگ ہر وقت چھتری اپنے ساتھ رکھتے ہیں تا کہ بوقت ضرورت استعمال کر سکیں۔ سفر نامہ نگار کہتی ہیں۔

> "کچھ دیر بعد ہلکی پھوار شروع ہو گئی۔ اگر یہ اصیل نہ پڑتی تو لندن والے پارٹی کو مستند کیسے مانتے۔ اگر انگلستان کی شے ہے تو ضرور رسیلی ہو گی۔ پلک جھپکتے میں ہزاروں چھتریاں کھل گئیں۔ یا اللہ یہ کہاں سے آئیں۔ کیا محل میں کرائے پر چلتی ہیں۔ پتہ چلا کہ ہر مرد کے ہاتھ میں جو نازک سی چھڑی تھی۔ وہ اصل میں چھتری تھی۔"(۲۳)

برطانیہ کی سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری ہیں۔ یہ اس مہذب قوم کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ یہ ہر جگہ قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ الغرض اس قوم کی طرز زندگی کا ہر انداز دلکش اور سلیقے والا ہے۔ جس نے سفر نامہ نگار کو بہت زیادہ متاثر کیا اور وہ ہر جگہ اس قوم کے مہذب پن کے گیت گاتی ہیں۔ سیاحت کے فروغ اور ترقی و خوشحالی کے لیے ہمیں بھی آمد و رفت کے ذرائع کو بہتر سے بہتر کرنا ہو گا تب ہی ترقی یافتہ ممالک سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ وہ برطانیہ کی سڑکوں کا پاکستانی سڑکوں سے تقابل کرتے ہوئے کہتی ہیں۔ "پہلی دفعہ برطانیہ کی نئی تیز ترین شاہراہ (M1) پر اسی میل کی رفتار پر کار چلائی، جس کا اتنا احساس ہوا، جو ہماری سڑکوں پر پچیس میل کی رفتار کا، لطف آ گیا ڈرائیوری کا!"(۲۴)

آئس کریم اور کولڈ ڈرنک کے کلچر کو اس قوم نے خوب فروغ دیا ہے۔ سیر و تفریح کے شوقین یہ قوم تفریح کے تمام لوازمات کا بھی خیال رکھتی ہے۔ ایک طرف سیاحت کے پُر فضا مقامات ہیں تو دوسری طرف جدید سہولتوں کی فراہمی کی وجہ سے سیاحت کا مزہ دوبالا ہو تا ہے۔ اسی باعث یہ سیاحت کے میدان خوب زر مبادلہ کما رہے ہیں۔

> "ہم سے بہت پہلے یہ جھیل مصوروں کا مسکن تھی۔ قدرت کے نقالوں نے اس کے ہر بوٹے کو فیتے سے ناپ کر رنگوں میں اتارا۔۔۔ لیکن اب تو کاروں میں ہماری طرح سیاح بھرے ہوئے تھے۔ گلوں میں کیمرے، دور بین اور جن کو پیسے کی نہیں وقت کی کمی تھی لیکن ہمیں یہ جھیل ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہی ماڈرن تفریحات کے لوازمات۔ وہی کاروباری تفریح کے ٹکٹ، فوٹو گرافر، ہوٹ ڈوگ، آئس کریم کے بوتھ۔"(۲۵)

بیگم اختر ریاض الدین کو یہاں کے تہوار اور میلے بہت پسند آئے۔ انہوں نے یہاں کی معاشرت کی چہل پہل سے خوب لطف اُٹھایا۔ آپ نے کئی دفعہ یورپ کے سفر کیے۔ جس کی وجہ سے انہیں مغربی ثقافت کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بیگم اختر ریاض الدین نے اس سماج کا بھرپور مشاہدہ کیا اور پھر یہاں کے میلوں اور تہواروں میں پیش ہونے والے ثقافتی جزئیات کو تفصیل سے بیان کیا۔ الغرض آپ نے مغربی ثقافت کو بہت عمدگی سے بیان کیا۔

ب: "گوروں کے دیس میں" ثقافتی عناصر کی پیشکش:

i. رسم ورواج کی پیشکش:

عطاء الحق قاسمی نے سفر برطانیہ کے دوران وہاں کے رسم ورواج کا مشاہدہ کیا۔ برطانیہ کی ثقافت آفاقی ثقافت بنتی جا رہی ہے۔ جس نے ہر خطے کی ثقافت پر اثر ڈالا ہے۔ ہر خطے کے اپنے مخصوص رسم ورواج ہوتے ہیں۔ سفر نامہ نگار نے وہاں کے حالات زندگی اور بود وباش کو قریب سے دیکھا۔ وہ ان کے خوشی و غم کی کیفیات کا براہ راست مشاہدہ کرتا ہے۔ وہاں کے مشاعروں اور تھیٹروں کا جائزہ لیتا ہے۔ یوں اس قوم کی ثقافت کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

برطانیہ میں عام طور پر ایک ہی قسم کا لباس زیب تن کیا جاتا ہے۔ ہیٹ پہننا ان کی لازمی روایت بن چکا ہے۔ اہل مغرب کا لباس آفاقی لباس بنتا جا رہا ہے۔ ان کے صاف رنگ کی طرح ان کا لباس بھی صاف ستھرا اور نفیس ہوتا ہے۔ سوٹ، سکرٹ، جین اور پینٹ ان کا مخصوص لباس ہے۔ مرد بوٹ جبکہ خواتین اکثر اونچی ہیل والی جوتی کا استعمال کرتی ہیں۔ سفر نامہ نگار ان کے لباس کو شدید تنقید کا نشانہ بھی بناتا ہے۔ کیونکہ ان کی نظر میں یہ اخلاقی بے راہ روی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

> "سکرٹ، جین، ہاٹ پینٹ اور دوسرے ملبوسات یا غیر ملبوسات سے خود کو آراستہ کیے ہوئے میمیں زلفیں کاندھے پر لہرائے اور اونچی ہیل کی جوتی سے ٹک ٹک کی آواز پیدا کرتی تیزی سے برق سیڑھیوں کی طرف لپک رہی تھیں۔ یہ وہی میمیں ہیں جو یورپ کا سفر اختیار کرنے والے بیشتر مسافروں کی اعصاب ہر سوار ہوتی ہیں۔"[۲۶]

ہیٹ کا استعمال برطانیہ میں بہت مقبول ہے۔ جو ان کے کلچر کا حصہ بن گیا ہے۔ برطانیہ کی اکثریت یہاں تک کہ شاہی خاندان کے افراد اس کا استعمال کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کہتا ہے۔ "ان میں سے ایک

نوجوان اپنا ہیٹ راہ گیروں کے آگے پھیلائے کھڑا تھا۔"(۲۷)

سفر نامہ نگار نے برطانیہ کی طرز معاشرت کا جس عمدگی سے تذکرہ کیا ہے اس سے وہ ایک ماہر نفسیات لگتا ہے۔ وہ لوگوں کے رویوں سے ان کی اصل شخصیت کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔ مصنف اہل مغرب کی کتب بینی کے شوق کو بھی بیان کرتا ہے۔ کتاب سے محبت اور لگاؤان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ یہ لوگ ہر جگہ کتاب کو ساتھ رکھتے ہیں۔ یہ شوق ان کے رسم ورواج کا حصہ بن چکا ہے۔ چھوٹا بڑا ہر کوئی مطالعہ کا شائق لگتا ہے۔ سفر نامہ نگار کہتے ہیں۔

> "انگریز قوم کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔ چنانچہ تمام مرد خواتین ایک دوسرے سے بے نیاز اخبار کے مطالعے میں مشغول تھے یا کوئی انعامی معمہ حل کر رہے تھے اس کے ساتھ یہ اونگھ بھی رہے ہوتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ صرف آپس میں بات نہ کرنے کا بہانہ ہے۔ کیونکہ ان سے گفتگو کریں تو اندازہ نہیں ہوتا کہ کتاب تو کیا اخبار بھی پڑھتے ہوں گے۔"(۲۸)

اہل یورپ فنون لطیفہ سے بے انتہا لگاؤ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ فنکار اور فن دونوں کے قدر دان ہیں۔ مصوری، موسیقی اور رقص سے لگاؤ کی مثالیں ہر جگہ بکھری نظر آتی ہیں۔ لندن میں بہت سے عجائب گھر فنون لطیفہ اور تہذیب و ثقافت سے گہری وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ تہذیب و ثقافت کے ساتھ تاریخی اہمیت کے بھی حامل ہیں۔ عجائب گھر میں نامور شخصیتوں کے نادر مومی پتلے رکھے گئے تھے۔ یہ مومی پتلے انسانی ہاتھوں کی کاریگری کا ثبوت بھی ہیں۔ برٹش میوزیم اس تہذیب کے مختلف ادوار کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ نیشنل آرٹ گیلری میں مصوروں کی پینٹنگز دیکھ کر مصنف ان کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہ رہ سکا۔ فنون لطیفہ ایک مفید سرگرمی ہے اور یہ ثقافت کو تاریخ کا حصہ بنانے میں بھی معاون ہیں۔

> "اس عجائب گھر میں گھومتے ہوئے کئی دفعہ یہ شبہ ہوا کہ وہ شخصیت جیتی جاگتی صورت میں سامنے کھڑی ہے اور گفتگو کے لیے شاید وہ ابھی لب کھولے گی۔ اس عجائب گھر میں لینن، شاہ فیصل، ملکہ الزبتھ، پنڈت نہرو اور دوسری عالمی سیاسی شخصیتوں کے علاوہ نامور کھلاڑیوں، موسیقاروں اور شاعروں کے مومی پتلے بھی ہیں۔"(۲۹)

ایک اور مقام سفر نامہ نگار فنون لطیفہ کے پہلو پر بات کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> "اور ہم نیشنل آرٹ گیلری میں دنیا کے ممتاز مصوروں کی پینٹنگز میں گھرے ہوئے

> تھے۔ یہاں کلاسیکی مصوروں کی نہایت حسین پینٹنگز دیواروں پر آویزاں تھیں۔ یہ بلاشبہ فن کا اعلیٰ نمونہ تھیں مگر میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان سے بڑے مصور بھی دنیا میں موجود ہوں گے جنہیں کوئی عالمی مقام حاصل نہیں ہو سکا۔"(۳۰)

لندن کا موسم عام طور خوشگوار ہوتا ہے اور یہاں کے باشندے سیر و سیاحت کے بہت زیادہ شوقین ہیں۔ یہ اس خوشگوار موسم سے لطف اٹھاتے ہیں۔ سیاحت انسان کو روز مرہ کی مشکل اور اکتاہٹ والی زندگی سے باہر نکلنے کا موقع بھی فراہم کرتی ہے۔ اب سیاحت باقاعدہ رسم بن چکی ہے۔ یہ لوگ ہر اتوار کو گھومنے پھرنے کے لیے نکل جاتے ہیں۔ سیاحت کے ساتھ غسل آفتابی بھی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ "جس روز لندن میں دھوپ نکلی ہو، وہ دن خوبصورت دنوں میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں مقامی باشندے قطار در قطار گھاس پر لیٹ جاتے ہیں۔"(۳۱)

سفر نامہ نگار نے اس طرزِ معاشرت کے جن پہلوؤں سے پردہ اٹھایا ہے ان میں سے ایک شراب نوشی بھی ہے۔ شراب نوشی کی عادت ان کی فطرت ثانی بن چکی ہے۔ مختلف تقاریب میں اس کا خصوصی اہتمام کی جاتا ہے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ اکثر خواتین بھی شراب نوشی کرتی ہیں۔ اہل مغرب شراب نوشی کو معیوب نہیں سمجھتے۔ اسلامی معاشرے میں قابل گرفت سمجھے جانے والی اس لعنت کو یہ لوگ برائی تک تصور نہیں کرتے۔ مصنف اپنے سفر نامے میں مختلف مقامات پر اس کی منظر کشی کرتا ہے۔

> "ان کے ہاتھوں میں شراب کی خالی بوتلیں اور بیئر کے خالی ٹن تھے۔ جنہیں وہ بار بار منہ کے ساتھ لگاتے کہ شاید شراب کا کوئی بچا کھچا قطرہ ان کے حلق میں چلا جائے۔ ان نشہ بازوں میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے جو اپنی اصل عمروں سے زیادہ لگ رہے تھے"(۳۲)

یہاں کے لوگ فاسٹ فوڈ کے شوقین ہیں۔ بچے اور بڑے سبھی فاسٹ فوڈز کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ برگر، کولڈ ڈرنکس اور آئس کریم شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ گوشت، انڈے، خشک میوہ جات اور مچھلی ان کی مرغوب غذائیں ہیں۔ "کچھ ہی دور چلنے کے بعد فاسٹ فوڈ کے ایک ریستوران پر نظر پڑی، ہم اندر داخل ہوئے۔۔۔۔ اس نے ہمارے لیے حلال گوشت کے برگر تیار کیے جو ہم نے وہیں کھڑے کھڑے کھانے شروع کر دیئے۔"(۳۳)

برطانیہ میں مقیم بہت سے پاکستانی اور انڈیا کے شہری اکثر مشاعروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس میں کثیر

تعداد میں مرد و خواتین شریک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ثقافت سے منسلک ہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص قومی لباس زیب تن کیے ہوتے ہیں۔ مشاعرے ایک مفید قسم کی ثقافتی سرگرمی ہے۔ ان میں نہ صرف زبان و ادب کو فروغ ملتا ہے بلکہ یہ تفریح کے مواقع بھی فراہم کرتی ہے۔ سفر نامہ نگار ایک مشاعرے کے احوال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"برمنگھم یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوتے ہی شلواریں، ساڑھیاں اور شیروانیاں نظر آنا شروع ہو گئیں یہ مشاعرے کے سامعین تھے جو جوق در جوق مشاعرہ سننے کے لیے چلے آ رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ٹریبونل تھا جس کے سامنے ہم پیش ہونے کے لیے جا رہے تھے۔"(۳۴)

یہاں کے لوگ فلم بینی اور موسیقی کے بھی دلدادہ ہیں۔ جس کی وجہ سے یہاں فلم انڈسٹری بہت فروغ پا رہی ہے۔ یہ لوگ تفریح کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے ہیں۔ شراب اور موسیقی دونوں اس قوم میں رچ بس گئی ہے۔ یہ تفریح کے نام پر شراب پیتے ہیں۔ اس کے ساتھ اعصاب کو تباہ کر دینے والی موسیقی بھی سنتے ہیں۔ یہ آسائشوں کے لیے حقیقی خوشیوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

"مغرب کا انسان ہفتے میں پانچ دن مشینوں کے سامنے کھڑے ہو کر روبوٹ کی مانند کام کرتا ہے اور دو دن تفریح کرتا ہے، یہ تفریح عموماً شراب و شباب کی صورت میں ہے، کانوں کے پردوں اور اعصاب کو تباہ کر دینے والے میوزک پر پاگلوں کی طرح چیختے چلاتے ناچتے کی صورت میں ہے۔"(۳۵)

برطانوی معاشرے میں مقیم پاکستانی اپنے وطن سے آنے والے مہمانوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہیں۔ مہمان نوازی جو کہ مسلم ثقافت کا خاصا ہے یہ لوگ اس کا بھرپور ثبوت دیتے ہیں۔ اپنے ملک سے آنے والے بھائیوں کو اپنے گھروں میں ٹھہراتے ہیں اور ہر طرح کی سہولیات بھی فراہم کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار اس بات سے انتہائی متاثر نظر آتا ہے کہ پاکستانی اپنی روایات کو بھولے نہیں اور مہمان نوازی کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔

"پاکستانی دنیا میں کہیں بھی چلا جائے، وہ اپنی روایات فراموش نہیں کرتا، اس ریستوران میں بھی سیلف سروس تھی مگر ڈاکٹر پرویز ہمیں ایک میز کے گرد بٹھا کر خود لائن میں لگ گئے اور پانچ آدمیوں کا کھانا ایک بڑی ٹرے میں ڈال کر لائے اور اسے

مہمانوں کی میز پر سجا دیا حالانکہ ڈاکٹر پرویز بہت اعلیٰ سماجی رتبے کے حامل ہیں مگر بطور میزبان ویٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔"(۳۶)

سفر نامہ نگار نے اپنے سفر نامے میں یورپ میں مقیم سکھوں اور ہندوؤں کی طرز معاشرت کی بھی عکاسی کی۔ بہت سے ہندو یہاں آکر مغربی معاشرت کے زیر اثر آگئے ہیں۔ مغرب کی پر رونق زندگی نے انہیں متاثر کیا ہے۔ یہاں آکر ان کے لباس، وضع قطع اور رویئے بدل گئے ہیں۔ کچھ ہندو لڑکیوں نے انگریزوں سے شادیاں بھی کر لی ہیں۔ تاہم کچھ اپنی اقدار و روایات قائم رکھے ہوئے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس سکھ قوم کے افراد اپنی مخصوص طرز زندگی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ جن کے رسم و رواج ان کی خاص پہچان ہیں۔ یہ مغربی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں بات کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اپنی چال ڈھال، لباس، زبان اور خاص رویئے سے جلد ہی پہچانے جاتے ہیں۔

"ساؤتھ ہال میں چہل قدمی کرتے ہوئے چند لمحوں کے لیے ہمارے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ ہم لندن میں ہیں۔ سڑکوں پر ریڑھیاں کھڑی تھیں جن میں ہوزری کا سامان پڑا تھا، پان کی دکانیں، اپنی مسند پر چوکڑی مار کر بیٹھا ہوا حلوائی، پٹھورے اور نان چھولے والے، سکرٹ پہن کر ہندو لڑکیاں، شلوار قمیص میں ملبوس سکھنیاں، داڑھیوں اور کڑوں والے سکھ، سامنے سے دو کلین شیو نوجوان نظر آ رہے تھے۔۔۔۔ بھارتی لڑکیاں اپنے لباس اور طور اطوار سے پاکستانی لڑکیوں سے الگ طور پر پہچانی جاتی ہیں۔"(۳۷)

عطاء الحق قاسمی نے اہل مغرب کی مثبت سرگرمیوں کو سراہنے کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کی منفی سرگرمیوں پر ان کو آڑے ہاتھوں بھی لیا ہے۔ وہ ظاہری حسن کے ساتھ ان کے اندر کے تاریک پہلوؤں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں۔

ii. تہواروں اور میلوں کی پیشکش:

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر نامے "گوروں کے دیس میں" اہل یورپ کے طرز معاشرت کی عکاسی اچھی طرح سے کی ہے۔ اہل مغرب اپنی زندگیوں کو بھرپور طریقے اور سلیقے سے گزارنے کے قائل ہیں۔ وہ صحت مندانہ زندگی گزارنے کے لیے میلوں اور تہواروں کا انعقاد بھی کرتے ہیں تاکہ مصروف زندگی سے کچھ وقت نکال کر لطف اندوز ہو سکیں۔ انہوں نے اپنے سفر نامے میں وہاں کے تہواروں اور میلوں کا بھی تذکرہ کیا

ہے تاہم وہ ان کا زیادہ احوال بیان نہیں کر پائے۔

سفر نامہ نگار نے اہل یورپ اور ان کی طرزِ معاشرت کو قریب سے دیکھا۔ وہ ان کے مختلف سماجی پہلوؤں پر کھل کر طنز اور تنقید کرتے ہیں تاہم ان کے مثبت پہلوؤں اور طرزِ عمل کو سراہتے اور اس سے متاثر بھی لگتے ہیں۔ یہ مختلف طرح کی سرگرمیوں کا اہتمام کرتے ہیں جن میں میراتھن ریس بھی ہے جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگ حصہ لیتے ہیں۔ یہ چھتیس میل طویل دوڑ ہوتی ہے۔ سفر نامہ نگار اس کا احوال یوں بیان کرتا ہے۔

> "اعجاز کے شوق بڑے متنوع ہیں شاعری کرتا ہے۔ مشاعروں میں شاعروں پر ہوٹنگ کرتا ہے، کتابیں پڑھتا ہے دوستوں کی محفلیں جماتا ہے۔ اسپورٹس میں شریک ہوتا ہے۔ گذشتہ دنوں اس نے برطانیہ میں ہونے والی سب سے لمبی ریس یعنی چھتیس میل دوڑ میں حصہ لیا۔"(۳۸)

جس طرح مسلمانوں کے سال میں خوشی کے دو تہوار عیدالضحیٰ اور عید الفطر ہوتے ہیں۔ اسی طرح یورپ میں بسنے والے مسیحی لوگ سال میں دو دفعہ خوشی کے تہوار یعنی ایسٹر اور کرسمس مناتے ہیں۔ جس میں مذہبی اور ثقافتی قسم کی سرگرمیاں بھرپور طریقے سے اجاگر ہوتی ہیں۔ خوبصورت ملبوسات پہننے اور رنگارنگ قسم کے کھانوں اور ضیافتوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہ تہوار نہ صرف خوشیوں کا موقع فراہم کرتے بلکہ اپنی ثقافت سے جڑے رہنے کا درس بھی دیتے ہیں۔ ان مواقعوں پر تحفے تحائف کا تبادلہ بھی کیا جاتا ہے۔ "یہاں بزرگ کی حیثیت سے اولڈ پیپلز ہوم میں اپنی زندگی کے باقی دن گزاریں گے جہاں انہیں بیٹے کی جانب سے کرسمس کے موقع پر تہنیتی کارڈ موصول ہو گا۔"(۳۹)

یورپ میں مقیم پاکستانی اپنے غم اور خوشیاں اپنی ثقافت کے مطابق مناتے ہیں۔ ایسے مواقعوں پر بندہ مغرب میں ہوتے ہوئے بھی خود کو مشرق میں محسوس کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار کو مشرقیت سے عشق ہے وہ اپنی اقدار سے گہری جذباتی وابستگی رکھتا ہے۔ جس طرح پاکستان میں عید کے موقع پر خوبصورت ملبوسات اور پر تکلف کھانوں کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ اسی طرح غم اور دکھ کے موقع پر اپنی ثقافت نظر آتی ہے۔ یہ لوگ مادہ پرست معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اپنی اقدار و روایات سے جڑے ہوئے ہیں۔ مغرب کا سرمایہ درانہ اور اخلاق باختہ نظام ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ عطاء الحق قاسمی کی خاصیت ہے، وہ مغربی ترقی سے متاثر ہو کر اس کے سحر میں گم نہیں ہوتے۔ وہ مشرقی اقدار کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا شعور اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ جڑا

ہوا ہے۔

"جب ہم ہال میں داخل ہوئے تو ہال پاکستانیوں سے بھرا ہوا تھا بے شمار لوگ اپنے لباس، اپنے کلچر، اپنے مذہب، اپنے خدوخال اور اپنے خلوص کی خوشبو کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ یہاں خواتین بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ خوبصورتی ایک معروضی چیز ہے۔۔۔ لیکن باطنی حسن جب انسان کی خوبصورتی میں داخل ہوتا ہے تو اس کے نمبر الگ سے لگانا پڑتے ہیں اور میرے نزدیک اس میں ثقافتی ہم آہنگی ایک اہم جزو کے طور پر شامل ہوتی ہے۔"(۴۰)

سفر نامہ نگار کے لیے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ برطانیہ میں مقیم پاکستانی اپنی اقدار وروایات کو نہیں بھولے۔ مغربی ثقافت کے اندر رہتے ہوئے بھی وہ اپنے غم اور خوشیاں اپنی ثقافت کے مطابق مناتے ہیں۔ مغرب کی مادہ پرستی انھیں زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ یہ لوگ نہ صرف اپنی روایات پر قائم ہیں بلکہ اس کے فروغ کا باعث بھی بنتے ہیں۔

iii. رہن سہن اور سماجی روابط و آداب:

عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں طنز و مزاح اور منظر نگاری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ظرافت، حقیقت نگاری اور واقعات کا باریک بینی سے تجزیہ آپ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے سفر برطانیہ میں وہاں کے رہن سہن اور سماج کا مشاہدہ کیا اور اپنے سفر نامے میں ان کو تفصیل سے بیان کیا۔

سفر نامہ نگار کے مشاہدے میں یہ بات آتی ہے کہ برطانیہ کے لوگ قانون کے پابند ہیں۔ یہاں سب کے لیے برابر قانون ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کو قانون سے بالا تصور نہیں کر سکتا۔ وہ اعلیٰ روایات جو کہ مسلم تہذیب کا خاصا ہیں وہ اہل مغرب نے اپنا لی ہیں۔ ذات پات کے تصور کو سرے سے ہی ناپسند کیا جاتا ہے۔ سفارش اور رشوت جیسی بیماریاں اس سماج میں ناپید ہیں۔ ہر شخص کو مذہبی، سیاسی اور معاشی آزادی ہے۔ دوسروں کی زندگی اور معاملات میں دخل اندازی کو انتہائی نامناسب خیال کیا جاتا ہے۔ ہر شخص کی عزت نفس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جہیز کی بیماری جو کہ ہمارے ہاں بہت زیادہ ہے جس کے باعث اکثر طلاق تک نوبت آ جاتی ہے۔ لڑکی والوں کی عزت نفس کو شدید مجروح کیا جاتا ہے۔ مغربی معاشرہ اس چیز سے بالکل پاک اور صاف نظر آتا ہے۔ سفر نامہ نگار تفصیل کے ساتھ ان موضوعات کا جائزہ لیتا اور ان کی منظر کشی کرتا ہے۔

"مثلاً یہ کہ سرخ فیتے کا فرسودہ نظام نہیں ہے۔ جو قانون بنایا جاتا ہے، اس پر سختی سے

عمل کیا جاتا ہے، کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ ممکن نہیں۔ معاشی طبقے ہونے کے باوجود غیر طبقاتی فضا موجود ہے یعنی کسی کی عزت کو کچلنے کی پوری آزادی نہیں۔ جہیز کا رواج نہیں۔ دفتروں میں سازشیں ہوتیں ہیں مگر ترقی سازش کی بنیاد پر نہیں عموماً میرٹ پر ہوتی ہے دوسروں کے معاملات میں اس کی عدم موجودگی میں تو بات ہو جاتی ہے مگر اس کو بنیاد بنا پر کسی کی زندگی حرام نہیں کی جاتی۔ دماغ اگرچہ ذرائع ابلاغ کے مفتوع ہیں مگر بظاہر فکر کی آزادی نظر آتی ہے!"(۴۱)

سفر نامہ نگار نے اپنے سفر نامے میں مغربی طرزِ زندگی کا باریکی سے جائزہ لیا۔ ان کے مشاہدے میں آتا ہے کہ یہ لوگ مہذب زندگی گزارنے کے قائل ہو چکے ہیں۔ یہ اپنی زندگیوں کو کچھ خاص اصولوں اور ضابطوں کے مطابق گزارتے ہیں۔ وہ ان اصولوں کی پابندی ہر جگہ کرتے ہیں چاہے انہیں اس کے لیے تکالیف کا سامنا بھی کرنا پڑے۔ انہی اصولوں میں ایک قطار بندی ہے۔ یہ لوگ ہر پبلک مقام پر قطار بناتے نظر آئیں گے۔ یہ ان کی طرزِ زندگی کا ایک خوبصورت پہلو ہے۔ سفر نامہ نگار کہتا ہے۔

"لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر امیگریشن کے سامنے مسافروں کی طویل قطاریں لگی تھیں۔۔۔۔ سامنے والی قطار میں ایک گورا تھا جس سے کچھ فاصلے پر ایک گوری کھڑی تھی۔ گورے نے اپنے بیگ میں سے ایک غبارہ نما گیند نکالا جس میں منہ سے ہوا بھرنے کے بعد گورا اور گوری اسے والی بال کے طور پر استعمال کرنے لگے۔"(۴۲)

مصنف نے دورانِ سفر وہاں کے رہن سہن کو خوب پرکھا۔ اہلِ مغرب ایک عرصہ تک گھروں کے اندر باتھ روم بنانا نامناسب خیال کرتے تھے۔ آدھی صدی قبل ان کے گھروں میں باتھ روم نہ تھے۔ یہ لوگ بدبو کو ختم کرنے اور خوش نما لگنے کے لیے پرفیومز اور لوشنز کا استعمال کرتے تھے۔ باتھ روم بنانے کا آغاز مسلمانوں کے وہاں جانے اور رہنے کے بعد ہوا۔ مصنف ان کے چہروں کے پیچھے چھپی حقارت کو بھی سامنے لاتا ہے۔ ان کے چہروں کی خوبصورت مسکراہٹ کے پیچھے نفرت ہوتی ہے یہ خود کو برتر اور دوسرں کو کم تر خیال کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار ان کے ظاہر اور باطن کے فرق کو یوں بیان کرتا ہے۔

"مغرب کے ظاہر اور باطن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ روح کو تو چھوڑیں ان کے جسم بھی صاف نہیں، یہ لوگ بہت کم نہاتے ہیں، ۱۹۶۰ء تک گھروں میں باتھ روم نہیں ہوتے تھے۔ گھروں میں باتھ روم کی بدعت تو ہم لوگوں کے آنے کے بعد شروع ہوئی ہے۔ یہ جسم کی بدبو کو لوشنز اور پرفیومز سے مارتے ہیں چہرہ چونکہ نظر آتا ہے اس لیے

اس پر پانی کا چھٹا مار کے صاف کر لیتے، بصورت دیگر ٹشو پیپر سے کام چلا لیتے ہیں یہ آپ کو دیکھ کر چہروں پر کس قدر خوبصورت مسکراہٹ بکھیرتے ہیں۔"(۴۳)

لندن میں اب بھی بہت سی عمارتیں قدیم طرزِ تعمیر کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہاں کی عمارتوں میں عموماً یکسانیت ہے۔ یہ عمارتیں دیکھنے میں خوبصورت اور دلکش ہونے کے ساتھ صاف ستھری بھی ہیں۔ یہاں عام طور پر کثیر منزلہ عمارتیں ہیں۔ تاہم لندن کی اکثر گلیاں تنگ و تاریک ہیں۔ لندن ایک گنجان آباد شہر ہے چنانچہ تھوڑی سی جگہ پر گھر تعمیر کیے جاتے ہیں۔ برطانیہ میں باتھ روم بھی پاکستانی باتھ روم سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک ٹب میں پانی جمع کر کے نہایا جاتا ہے جس کے گرد پردہ بھی نہیں ہوتا۔ جبکہ ہاتھ منہ دھونے کے لیے بیسن میں پانی جمع کر کے چھپٹے مار لیے جاتے ہیں۔ سفر نامہ نگار برطانیہ کی عمارتوں اور خاص طور پر وہاں کے باتھ روم کی منظر کشی اس طرح کرتا ہے۔

"بخش کا گھر بھی اپنی تعمیر کے حوالے سے برطانیہ کے روٹین گھروں جیسا ہے یعنی گھر میں داخل ہوتے ہی پاؤں اوپر کی منزل پر جانے والی سیڑھیوں پر پڑتا ہے جو کم جگہ میں بنائی گئی ہوتی ہیں اور ان پر چڑھنا اور اترنا کسی موٹے انسان کے بس کا روگ نہیں۔ اوپر دو چھوٹے چھوٹے کمرے۔ ایک گیسٹ روم جس میں ایک گیسٹ اور اس کی چارپائی آ سکتی ہے۔ درمیان میں باتھ روم جس میں ٹب کے گرد کرٹن نہیں ہوتا کیونکہ برطانیہ میں نہانے کا نہیں اشنان کرنے کا رواج ہے۔ ایک بیسن جس میں گرم اور ٹھنڈے پانی کی ٹونٹیاں الگ الگ ہوتی ہیں مگر مکسر نہیں ہوتا۔ ٹھنڈا اور گرم بیسن میں جمع کر کے منہ پر پانی کے چھپٹے مارے جاتے ہیں۔"(۴۴)

مغرب کے لوگ نہ صرف خود صاف ستھرے اور نفیس نظر آتے ہیں بلکہ ان کے گھر اور گلی محلے بھی صاف ستھرے اور نکھرے نکھرے ہوتے ہیں۔ یہاں ہر گھر میں ایک ڈرائنگ روم ہوتا ہے جہاں مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ جسے دیکھ کے ان کی نفاست پسندی کی داد دینا پڑتی ہے۔ سفر نامہ نگار کو اس بات نے بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ "اہلِ مغرب سیاحوں کو ڈرائنگ روم دکھا کر مکمل گھر کے بارے ان کی رائے بہتر بنا لیتے ہیں۔"(۴۵) یہاں گھر نہ صرف صاف ستھرے بلکہ جدید سہولتوں سے بھی مزین ہوتے ہیں۔ مکانات اور ان کے سنوارنے کے حوالے سے یہ قوم نہایت مہذب ثابت ہوئی ہے۔

سفر نامہ نگار کی دوران سفر ایک ایسے انگریز سے ملاقات ہوتی ہے جو کہ برطانیہ کے معاشرے سے

کٹاہوا ہے۔ یورپ کے کریڈٹ کارڈ کا جرمانہ بھرنے والے سماج سے خود کو الگ رکھنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ اجتماعی خاندانی نظام کے مطابق زندگی بسر کرنا جو کہ مشرقی معاشرے کا خاصا ہے وہ اس انگریز نے اختیار کیا ہوا تھا۔ اس انگریز کے احوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب بھی اس معاشرے میں اعلیٰ خاندانی اقدار و روایات موجود ہیں۔ یہاں بوڑھوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ اجتماعی خاندان کے ناپید ہوتے ہوئے معاشرے میں اب بھی کچھ گھر ایسے ہیں جہاں اجتماعی خاندان کا تصور موجود ہے۔ یہ لوگ ابھی مادہ پرستی سے بچے ہوئے ہیں۔ تاہم ایسے خاندان بہت کم ہیں۔ سفر نامہ نگار نے ملاقات کا احوال یوں بیان کیا ہے۔

> "تمہیں ایک اور بات بتاؤں؟ ولیم نے کہا، میرا چھوٹا سا کاروبار ہے، میرا بیٹا ایک جگہ ملازمت کرتا ہے، میری بہو گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ہمارے گھر میں کریڈٹ کارڈ کا داخلہ منع ہے، ٹیلی ویژن پر مصنوعات کی کمرشلز آتی ہیں تو میں اپنے بچوں سے کہتا ہوں اپنی آنکھیں بند کر لو ورنہ یہ خوبصورت چیزیں تمہیں بدصورت بنا دیں گے۔ زندگی کو آرام دینے کے لیے زندگی عذاب نہ بناؤ۔"(۴۶)

مغرب میں گھورنے والے کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ دوسروں کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت کو پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ سفر نامہ نگار کہتے ہیں۔ "اس لیے کہ لڑکی کے ساتھ جو لڑکا ہے، وہ لڑکی سے بے فکر ہو کر تمہیں انہی نظروں سے گھور رہا ہے، جن نظروں سے تم اس لڑکی کو گھور رہے ہو۔"(۴۷)

اہل مغرب کی ایک اور بات جس نے سفر نامہ نگار کو بہت زیادہ متاثر کیا وہ ان لوگوں کا اپنی غلطی کو کھلے دل سے تسلیم کرنا ہے۔ یہ نہ صرف اپنی غلطیوں کو مان لیتے بلکہ اکثر ان کی تشفی بھی کرتے ہیں۔ مصنف کو اہل مغرب کی علم اور اہل علم سے محبت و عقیدت نے متاثر کیا۔ سفر نامہ نگار اپنے ملک کے قانون کا تقابل برطانوی قانون سے کرتا ہے۔ جہاں صورت حال قدرے مختلف ہے۔

> "میری اس تقریر کے دوران امیگریشن افسر کے چہرے کے تاثرات بدلتے رہے۔۔۔ مغرب والوں کی جو ادائیں بہت اچھی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ عموماً اپنے غلط موقف کا احساس ہونے پر اڑتے نہیں اور تلخ بیانی کو بھی برداشت کر لیتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں ایسے مواقع پر اس طرح بولنے والے کو چھتر بھی لگوائے جا سکتے ہیں۔"(۴۸)

سفر نامہ نگار نے مغرب کی مثبت اقدار کے ساتھ ان کی منفی اقدار کو بھی بیان کیا ہے۔ اس سماج کے بوڑھے افراد جنہوں نے ساری عمر بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت میں صرف کی ہوتی ہے۔ لیکن عمر کے آخری حصے میں یہ اولاد ان کو دھوکہ دیتی ہے اور انہیں اولڈ ہومز میں ڈال دیتی ہے۔ حالانکہ عمر کے اس حصے میں ان کو مناسب نگہداشت درکار ہوتی ہے۔ یہ چیزیں کسی بھی ثقافت کے زوال سبب بنتی ہیں۔ مشرقی لوگ اس حوالے سے خوش قسمت ہیں کہ یہ روایت ابھی اس معاشرے میں زیادہ پروان نہیں چڑھی۔ سفر نامہ نگار نے سینئر شہریوں کے ساتھ رکھے جانے اس ناروا سلوک کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ اولڈ ہومز کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں۔

> "بوڑھی میم نے نئے مسافر کے ساتھ بے ربط گفتگو شروع کر دی جس پر اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا یورپ اور امریکہ میں بوڑھوں کو سینئر شہری کہا جاتا ہے اور ریاست انہیں زندگی کی تمام سہولتیں فراہم کرتی ہے، صرف اتنا ہے کہ ان بوڑھوں سے کوئی بات نہیں کرتا۔"(۴۹)

سفر نامہ نگار نے یورپ کے خوبصورت اور دلکش دیہاتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ ان دیہاتوں کا اپنے قصبوں سے تقابل بھی کرتا ہے۔ مغرب میں فطری حسن ہر جگہ بکھرا نظر آتا ہے۔ پھر ان لوگوں کی جمالیاتی حس بھی ہے جو انہیں اپنے گھر اور ماحول کو صاف ستھرا رکھنے پر ابھارتی ہے۔ خوبصورت ماحول انسانی طبیعت پر خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہاں کے حسین باغات، دیہاتوں اور کھیتوں نے سفر نامہ نگار کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔

> "یورپ کے دیہات اور قصبے تو بے حد خوبصورت ہیں۔ جمالیاتی حس کو تسکین پہنچتی ہے اور طبیعت پر بے حد خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خدا جانے ہمارے گلی کوچوں، دیہاتوں اور قصبوں میں سے گندگی کے ڈھیر کب اٹھیں گے۔۔۔ چنانچہ اس نظام کی تمام گندگیاں ہمارے حصے میں آئی ہیں اور اس نظام کی تمام خوبصورتیوں سے ہم یکسر محروم ہیں!"(۵۰)

مغرب میں خاندانی نظام زوال پذیر ہے۔ بوڑھوں کو اُٹھا کر اولڈ ہاؤسز میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس معاشرے میں طلاق کا رواج عام ہو گیا ہے۔ طلاق کی صورت میں بچے ساری عمر کے لیے شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ عورت کی تذلیل جس قدر اس سرمایہ درانہ معاشرے نے کی، وہ دنیا میں کسی اور سماج نے نہ کی

ہو گی۔ مغرب کی بظاہر جنت نظر آنے والی طرز معاشرت اندر سے تاریک تر ہے۔ اس نظام نے بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی خوب تذلیل کی ہے۔مادہ پرستی کی وجہ سے یہاں خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ سفر نامہ نگار کہتا ہے۔

"خاندانی جھگڑوں کی صورت میں بچے والدین کی محبت اور التفات سے محروم رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے لیے بظاہر ایک جنت بسائی گئی ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے، باطن انتہائی تاریک ہے چنانچہ جو نظام بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی تذلیل کرتا ہے، میں ایسے نظام کو تہذیب یافتہ قطعاً نہیں مانتا۔"(۵۱)

مغربی معاشرے میں خواتین کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ وہ اپنی مرضی کا پیشہ یا کاروبار اختیار کر سکتی ہیں۔ ان کو مکمل مذہبی، سماجی اور معاشی آزادی حاصل ہے۔ یہاں کا قانون ان کی بھرپور رہنمائی اور مدد فراہم کرتا ہے۔ اس معاشرے میں شوہر خواتین کو تشدد کا نشانہ بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اگر کبھی ایسی نوبت آ بھی جائے تو خواتین قانونی چارہ جوئی کر سکتی ہیں اور ایسے میں ریاست ان کو مدد اور تحفظ فراہم کرتی ہے۔ سفر نامہ نگار یہاں بھی اس کا تقابل پاکستان سے کرتے ہیں کہ پاکستانی معاشرے کی عورت ابھی تعلیمی میدان اور اپنے حقوق سے آگاہی کے لحاظ سے بہت پیچھے ہے۔ "مگر مغربی عورت شوہر کے ظلم و تشدد سے بچاؤ کے لیے عدالت کی طرف رجوع کرتی ہیں جبکہ ہماری عورتیں ان رستوں سے بھی پوری طرح آگاہ نہیں۔"(۵۲)

یہاں کے لوگ ملاقات کے وقت حال احوال لازمی پوچھتے ہیں۔ اس دوران ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے اور ملاقات کے اختتام پر شکریہ بھی لازماً ادا کرتے ہیں۔ یہ چیزیں ان کے سماجی آداب میں لازم و ملزوم ہیں۔ یہ اپنے اقدار و روایات کو اپناتے ہوئے کبھی نہیں ہچکچاتے۔ ملاقات کے آغاز میں عموماً یہ لوگ ہائے کہتے ہیں۔ سفر نامہ نگار نے مقامی خاتون سے ملاقات کا احوال یوں بیان کیا۔ "ہائے! اس نے مجھ سے گرم جوشی سے میرے ہائے کا جواب دیا۔"(۵۳) پھر ملاقات کے اختتام کا منظر کچھ اس طرح ہوتا ہے۔ "تھینک یو، لڑکی نے اپنی آنکھیں جھپکاتے ہوئے ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔"(۵۴)

سفر نامہ نگار کو آگاہی ہوتی ہے کہ یہاں کی اکثریت نسل پرست ہے۔ اس قوم کا ظاہر انتہائی خوبصورت اور باطن بے حد بدصورت ہے۔ یہ لوگ اپنی زبان اور رنگ و نسل پر بہت نازاں ہیں اور دوسروں کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اس معاشرے میں بہت سے اچھے لوگ بھی ہیں تاہم مغربی ممالک کی اکثریت ایشیائی ممالک کے ساتھ رویہ غیر مناسب اور ظالمانہ ہے۔ یہ خود کو برتر جبکہ دوسروں کو کمتر خیال کرتے ہیں۔

یہ مغرور قوم پسماندہ ممالک کے شہریوں کو غیر مہذب گردانتی ہیں اور خود کو دنیا کی مہذب قوم کہلوانا پسند کرتی ہے۔

"یہ آپ کو دیکھ کر چہروں پر کس قدر خوبصورت مسکراہٹ بکھیرتے ہیں مگر اس میں سے نوے فیصد نسل پرست ہیں اور ہم لوگوں کو گھٹیا سمجھتے ہیں۔۔۔ یہ نسل پرست نوجوان ہمارے گھروں کو آگ لگاتے دیتے ہیں اور عام طور پر سزا نہیں پاتے، ان میں انفرادی طور پر تو پھر بھی اچھے لوگ مل جاتے ہیں لیکن جیسے تم جانتے ہو مغربی ممالک کا من حیث القوم کمزور اقوام کے ساتھ سلوک انتہائی سفاکانہ ہے!"(۵۵)

سفر نامہ نگار نے اہل مغرب کی طرز معاشرت کے کچھ منفی پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ وہ یہاں کی عصمت فروشی کی لعنت کو بھی منظر عام پہ لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عصمت فروشی کے لیے یورپ میں بڑے بڑے قحبہ خانے موجود ہیں۔ دراصل عورت کا استحصال ہر معاشرے نے کیا ہے کہیں طوائف کی صورت میں تو کہیں گیشا اور کہیں یہ کال گرل کی صورت میں کیا جارہا ہے۔ یہ عیش پسند امیروں کو تفریح طبع کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ مغرب کے بڑے قحبہ خانوں میں شراب بھی فروخت کی جاتی ہے۔ یہ عصمت فروشی کے ساتھ مہنگی شراب بیچ کر پیسہ کماتے ہیں۔ سفر نامہ نگار اس کو یوں بیان کرتا ہے۔ "پھر قطار اندر قطار نائٹ کلب ہیں جہاں دنیا کے بدترین شوز پیش کیے جاتے ہیں۔ جنہیں کہنے والے بہترین شو بھی کہتے ہیں۔ ہر کلب کے باہر ایجنٹ راہگیروں کو روک روک کر رازہائے اندرون خانہ سے آگاہ کرتے ہیں۔"(۵۶) ہم جنس پرستی بھی اس معاشرے کا ناسور بن چکی ہے۔ مغربی معاشرے نے اس کو باقاعدہ قانونی حیثیت بھی دے دی ہے۔ اس کے کلب اکثر مقامات پر نظر آتے ہیں۔ یہاں صرف ہم جنسوں کو جانے کی اجازت ہے۔ یہاں کے صنعتکاروں نے اسے باقاعدہ ایک صنعت کی شکل دے دی ہے۔ وہ ان کے بڑے بڑے کنونشن منعقد کرواتے ہیں جس میں ہم جنس پرستی کے فوائد کو گنوایا جاتا ہے۔ مغرب کا سرمایہ درانہ نظام اس بیمار اقلیت کا علاج کرنے کے بجائے اسے اکثریت میں بدل رہا ہے۔ فطری نظام کے باغی یہ لوگ ان کلبوں میں بے ہنگم موسیقی سنتے اور ڈانس کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار نے اپنے سفر نامے میں اس ذہنی معذور طبقے کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

"اندر کانوں کے پردے پھاڑنے والا میوزک تھا اور اس میوزک پر مرد وزن پاگلوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ یہاں وہ مرد تھے جو عورت کی شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے اور ڈانسنگ فلور پر وہ عورتیں تھیں جنہیں مردوں کا نام سننا گوارہ نہ تھا چنانچہ

مرد، مردوں کے ساتھ ناچ رہے تھے اور عورتیں، عورتوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے رقص میں مشغول تھیں۔"(۵۷)

سفر نامہ نگار نے برطانوی رہن سہن اور سماجی روابط و آداب کا باریک بینی مشاہدہ کر کے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس معاشرے نے رہن سہن کے لیے نہ صرف جدید طریقوں کو اپنایا ہے بلکہ ان کے گھر صاف ستھرے اور نفیس ہیں۔ یہ دوران ملاقات اپنی مخصوص روایات کی پاسداری لازمی کرتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے فرائض بجالاتا اور دوسروں کے معاملات میں دخل دینے سے اجتناب کرتا ہے۔ تاہم کچھ معاملات پر وہ اس معاشرے پر سخت تنقید بھی کی ہے۔

ج: "دھنک پر قدم" اور "گوروں کے دیس میں" کے ثقافتی عناصر کا تقابل:

i. اشتراکات:

بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر یورپ کے دوران وہاں کے تہواروں، رہن سہن، رسم و رواج اور سماجی روابط کو باریکی سے دیکھا اور اپنے اپنے تجربے اور بصیرت کے مطابق اپنے سفر ناموں میں ان کا تفصیلی جائزہ لیا۔ کچھ معاملات، مشاہدات اور رجحانات میں دونوں کے خیالات مشترک ہیں تاہم کہیں کہیں اختلاف بھی نظر آتا ہے۔

مغرب کی اعلیٰ اخلاقی اقدار و روایات کا بیان دونوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے۔ اہل مغرب نے مثبت روایات کو فروغ دے کر دنیا میں اپنا نام کمایا ہے۔ اس معاشرے میں سفارش اور رشوت جیسی برائیاں ناپید ہیں۔ میرٹ کو ہر حال میں فوقیت دی جاتی ہے۔ انہوں نے ایمانداری کے کلچر کو فروغ دیا ہے۔ دونوں سفر نامہ نگار مغرب کی ان اعلیٰ اقدار کو حد درجہ پسند کرتے اور ان کو سراہتے ہیں۔

سفر نامہ نگاروں کو ادراک ہوتا ہے کہ اہل یورپ کتب بینی کے دلدادہ ہیں۔ یہ لوگ ہر جگہ اور ہر وقت کتاب کو ساتھ رکھنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ آپ کو مختلف پبلک مقامات پر اور خصوصاً دوران سفر کتاب پڑھتے نظر آئیں گے۔ سرکاری سطح پر بھی اس حوالے سے خصوصی اقدامات کیے گئے ہیں۔ بہت زیادہ لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا گیا جن میں کتب سے محبت رکھنے والوں کو کتب کی فراہمی یقینی بنائی جاتی ہے۔ اس بات نے دونوں سفر نامہ نگاروں کو متاثر کیا۔

دونوں مصنفین نے مغرب میں مقیم مسلمانوں خصوصاً پاکستانیوں کا احوال بھی بیان کیا۔ برطانیہ میں

مقیم پاکستانی اپنے مذہبی تہوار جوش وخروش سے مناتے ہیں۔ ایسے مواقعوں پر ان کی تمام سرگرمیاں اپنی ثقافت میں رنگی نظر آتی ہیں۔ یہ لوگ مغربی معاشرے میں بھی اپنے رسم ورواج اور روایات کو اپناتے ہیں۔ یہ چیز دونوں سفر نامہ نگاروں کے لیے اطمینان کا باعث ہے۔ کہ مادہ پرست معاشرے میں بھی یہ لوگ اپنی اقدار کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اپنے سفر نامے میں کہتے ہیں۔

> "ان میں بیشتر کی جڑیں ثقافت اور مذہب میں خاصی گہری ہیں مگر صرف اس طرح کہ اگر ان کے والدین کو اس معاملے میں دلچسپی ہے۔ تمھارے لیے یہ بات باعث حیرت ہو گی کہ یہاں جس بچے کا مذہب کی طرف رجحان ہوتا ہے، وہ پاکستانیوں کے برعکس اپنے کردار میں انتہائی مضبوط ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا، دھوکا دینے سے اجتناب کرتا، دوغلے پن سے نفرت کرتا ہے اور اردگرد کے ماحول کے شدید دباؤ کے باوجود ایک سچے مسلمان کی تصویر نظر آتا ہے۔"(۵۸)

دونوں سفر نامہ نگاروں نے بعض مقامات برطانیہ اور پاکستانی معاشرے کا تقابل بھی پیش کیا ہے۔ ان کو جن اچھی اقدار نے متاثر کیا، وہ خواہش کرتے ہیں کہ ان اقدار کو ہمارے معاشرے میں بھی لازماً ہونا چاہیے۔ وہ وہاں قانون کی پاسداری، سیاحت کے مراکز، حقوق اور خاص طور پر نفاست کا تقابل پاکستان سے کرتے ہیں۔ اختر ریاض الدین وہاں کی دیہاتیوں کی نفاست کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں۔ "کہاں ہمارے کسان کہاں یہ صاف ستھرا گھر! بلکہ دو گھر!! فرنیچر بھدا پرانا، لیکن مکمل اور صاف۔"(۵۹) جبکہ عطاء الحق قاسمی کہتے ہیں۔

> "مجھے قصبے بہت اچھے لگتے ہیں خصوصاً یورپ کے دیہات اور قصبے تو بے حد خوبصورت ہیں۔ جمالیاتی حس کو تسکین پہنچتی ہے اور طبیعت پر بے حد خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خدا جانے ہمارے گلی کوچوں، دیہاتوں اور قصبوں میں سے گندگی کے ڈھیر کب اٹھیں گے؟"(۶۰)

دونوں سفر نامہ نگاروں نے مغربی معاشرے میں شراب نوشی کی برائی کو بھی بیان کیا ہے۔ یہاں شراب کا استعمال بہت زیادہ اور مردوں کے ساتھ خواتین بھی اکثر شراب نوشی کرتی ہیں۔ دونوں مصنفین کے نزدیک شراب نوشی کی وجہ سے مغرب اخلاقی برائیوں میں بری طرح گھِر چکا ہے۔ عطاء الحق قاسمی اس پر اہل مغرب کو زیادہ سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

"ایک نائٹ کلب کے پاس ایک جاپانی کھڑا شور مچا رہا تھا کہ مجھے کلب والوں نے لوٹ لیا، میں ٹکٹ خرید کر اندر گیا، میں ابھی نشت پر بیٹھا ہی تھا کہ نیم عریاں لڑکیاں میرے دائیں اور بائیں آکر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے مجھ سے شراب منگوانے کا کہا۔ میں نے ان دونوں کے ایک ایک پیک منگوایا، تھوڑی دیر بعد بل طلب کیا۔ یہ ایک سو ستر پاؤنڈ تھا۔"(۶۱)

دونوں سفر ناموں میں سفر نامہ نگاروں نے اہل مغرب کی جمہوری روایات کو بھی سراہا ہے۔ یہاں قانون سب کے لیے برابر اور ہر شخص قانون کا لازماً احترام کرتا ہے۔ جنس کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا۔ دونوں نے ہائیڈ پارک کی مثالیں بھی دیں، جہاں مقررین اتوار کے روز آکر مختلف موضوعات پر تقاریر کرتے۔ اس معاشرے میں شہریوں کے جذبات کا خیال رکھا جاتا ہے اور ہر طرح کی سہولیات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ الغرض دونوں سفر نامہ نگار مغرب کی ان روایات پسند کرتے ہیں۔

دونوں سفر ناموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اہل مغرب اپنی زندگیاں مخصوص اصولوں اور قوانین کے مطابق گزارتے ہیں، انہی میں سے ایک قطار بندی ہے۔ یہ لوگ ہر پبلک مقام پر کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ دوسروں کے جذبات کو مقدم سمجھتے ہیں۔ سفر نامہ نگاروں نے اہل مغرب کی اس اصول پسندی کو بہت پسند کیا۔

یورپ فطری حسن اور خوشگوار موسم کا تذکرہ دونوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے۔ تاہم "گوروں کے دیس میں" کی نسبت "دھنک پر قدم" میں فطرت کی منظر کشی بہت زیادہ اور عمدہ طریقے سے کی گئی ہے۔ ایک مقام پر اختر ریاض الدین یورپ میں فطرت کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

"آلز واٹرز انگریزی جھیلوں میں سب سے زیادہ نیک خصلت و خاندانی سمجھی گئی ہے۔۔۔۔ یہاں کے پانی دن کی روشنی کے ساتھ ساتھ اپنے کئی رنگ بدلتے ہیں۔ یہاں گھاس پر چلنے کو دل نہیں چاہتا کہ کہیں زمردیں زیست پامال نہ ہو جائے۔ یہ علاقہ اپنی صدائے بازگشت کے لیے مشہور ہے کوئی پٹاخہ کوئی دھماکہ ہو۔ دیر تک پہاڑ گونجتے رہتے ہیں۔ اس شور سے سنا ہے کہ وہاں کی جنگلی مرغابیاں اپنے مانوس پانی چھوڑ کر چلی گئیں۔"(۶۲)

بیگم اختر ریاض الدین نے مغرب میں موجود سکھوں کو اپنی روایات سے جڑا دیکھا۔ اس بات نے ان

کو متاثر کیا کہ یہ لوگ دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں اپنی ثقافت سے وابستہ ہی رہیں گے۔ جبکہ دوسری طرف عطاء الحق قاسمی نے سکھوں کا کچھ ایسے ہی احوال بیان کیا ہے۔ وہ مختلف مقامات پر ان سے ملاقاتوں کا احوال اور خصوصاً ان کے پنجابی جملوں کو اپنے سفر نامے میں لکھا ہے۔

> "اعجاز کا گھر ساؤتھ ہال میں ہے۔ یہ علاقہ پاکستانیوں اور بھارتیوں کا ہے اور بھارتیوں میں سکھ زیادہ ہیں۔۔۔ ساؤتھ ہال کی ایک خصوصیت یہاں بولی جانے والی پنجابی بھی ہے جو کچھ اس قسم کی ہوتی ہے۔ ڈوراں کلوز کر دیو، انگلینڈ دی روڈاں بیوٹی فل نیں وغیرہ۔"(۶۳)

دونوں سفر نامہ نگاروں نے اہل مغرب کی مثبت اور منفی ثقافتی سرگرمیوں کو اپنے اپنے انداز سے بیان کر کے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اکثر ثقافتی عناصر دونوں کے ہاں یکساں ہیں۔

ii. افتراقات:

"دھنک پر قدم" میں مصنفہ نے برطانیہ کی شاہی زندگی کا ذکر تسلسل سے کیا ہے۔ وہ وہاں کی شاہی خاندان، شاہانہ زندگی اور شاہی عمارات سے حد درجہ متاثر نظر آتیں ہیں۔ ان کے مشاہدے میں آتا ہے کہ اہل برطانیہ اپنی ملکہ سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ ملکہ ان کے لیے اتحاد کی علامت ہے۔ جبکہ "گوروں کے دیس میں" برطانیہ کے شاہی خاندان کے متعلق کوئی بات نہیں کی گئی۔ بیگم اختر ریاض الدین ایک شاہی تقریب کی منظر کشی یوں کرتی ہیں۔

> "بکنگھم پیلس کے کشادہ لان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔۔۔ اللہ ہو غنی! انگلستان کے جدی رُوساء ٹیل کوٹ اور تحفوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ بعض کے سینوں پر اتنی تعداد میں تمغے لٹک رہے تھے جو اکثر شعبدہ بازوں کی وردی پر ہوتے ہیں۔ بعض لارڈز اور نائٹ اتنے عمر رسیدہ تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری انیسویں صدی انہوں نے گود میں کھلائی ہے۔"(۶۴)

"دھنک پر قدم" میں سفر نامہ نگار نے برطانوی کھانوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ مختلف ریستورانوں کا احوال بیان کرتی ہیں جہاں ہندوستانی کھانے بنائے اور پسند کیے جاتے ہیں۔ انگریز جو کبھی چٹ پٹے کھانے سے پرہیز کرتے تھے لیکن اب مصالحے دار کھانے شوق سے کھاتے ہیں۔ مصنفہ نے اس کا سبب انگریزوں کا ہندوستان میں طویل قیام بتایا ہے۔ کھانے اور کچن سے متعلقہ زیادہ باتیں مصنفہ نے خاتون خانہ ہونے کی وجہ سے بھی کی

ہیں۔ "گوروں کے دیس میں" مصنف کے مشاہدے میں آتا ہے کہ یہ قوم فاسٹ فوڈز کی دلدادہ ہے۔

بیگم اختر ریاض الدین اپنے سفرنامے میں ہر جگہ برطانوی سماج کے گن گاتے نظر آتی ہیں یہاں کی ثقافت اور شاندار طرزِ زندگی نے ان کو بہت متاثر کیا ہے۔ لیکن عطاء الحق قاسمی ان کی طرزِ معاشرت اور طرزِ فکر پر تنقید بھی کی ہے۔ کہ اہل یورپ کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہے۔ یہ خود کو نسلی لحاظ سے دوسروں سے برتر خیال کرتے ہیں۔ وہ جس قدر نفیس نظر آتے ہیں اسی قدر اندر سے دوغلے پن کا شکار ہیں۔ ان کے ہاں دوہرے اخلاقی معیارات ہیں۔ مصنف ان کے دوہرے اخلاقی معیار کی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے۔

> "یورپ کے ممالک میں ساحل سمندر کو گھر کے غسل خانے کا درجہ دیا گیا ہے۔ ویسے مجھے اپنے معاشرے کی طرح مغرب والوں کے دوہرے اخلاقی معیار کی سمجھ نہیں آتی۔ ایک طرف ساحل سمندر اور سوئمنگ پول کو انہوں نے چادر اور چار دیواری سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور دوسری طرف اگر آپ سلیپنگ سوٹ پہن کر کسی معزز مہمان کے سامنے آجائیں تو وہ مارے حیا کے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔"(۶۵)

"دھنک پر قدم" میں واقعات، مناظر اور مختلف احوال کو اختصار سے بیان کیا گیا۔ جبکہ "گورروں کے دیس میں" سفر نامہ نگار نے ہر بات کا اکثر مکمل تفصیل اور تمام تر جزئیات کے ساتھ اظہار کیا۔

"گوروں کے دیس میں" سفر نامہ نگار نے اکثر مشاعروں کا تذکرہ کیا۔ مشاعروں کے حوالے سے "دھنک پر قدم" میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ چونکہ عطاء الحق قاسمی خود شاعر ہیں اور ان کے سفر کا اہم مقصد ان مشاعروں میں اپنے دوستوں کے ہمراہ شرکت کرنا تھا۔ انہوں نے ان مشاعروں میں شرکت کرنے والے پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی ثقافت کو بیان کیا۔ مشاعروں میں مشرقی کلچر انہیں بہت پسند آیا۔ سفر نامہ نگار اکثر کہتے ہیں، کہ وہ مشرقی ثقافت سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتے ہیں۔ وہ ایک مشاعرے کی منظر کشی یوں بیان کرتے ہیں۔

> "قبرستان اور مشاعرہ گاہ میں اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا زندگی اور موت کے درمیان ہوتا ہے۔ جہاں سے ہم آئے تھے وہاں موت کا سناٹا تھا اور جہاں ہم پہنچنے والے تھے وہاں زندگی کی رونقیں تھیں۔ پاکستانی خواتین حضرات مشاعرہ کی طرف رواں دواں تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ پیاسے ہیں جن کا رخ دریا کی طرف ہے۔"(۶۶)

"دھنک پر قدم" میں مصنفہ نے مختلف تہواروں اور میلوں کا احوال بیان کیا ہے۔ مصنفہ کے بقول

یہاں کے تہوار اور میلے سرکاری سرپرستی کی وجہ ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ آپ نے مختلف میلوں میں خود بھی شرکت کی اور اس ثقافت کو بہت سراہا۔ جبکہ " گوروں کے دیس میں " مصنف نے میلوں کا کہیں ذکر نہیں کیاہے۔ بیگم ختر اریاض الدین اپنے سفر نامے میں ایک نمائش کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

"پکاسو کی سب سے بڑی نمائش جو ٹیٹ گیلری کے دس بڑے ہالوں پر غالب تھی۔ چل چل کر جب میرے جوتے چھوٹے ہو گئے تو میں نے اتار کر ایک کونے میں رکھ دیئے وہاں کا حاضر جواب ملازم بولا۔ انھیں الٹے سیدھے ٹانگ دوں تو یہ 'پکاسو' ہو جائیں گے۔ قصہ کوتاہ لندن کی ثقافتی سرگرمیاں سال تا سال ماہ بہ ماہ اسی رفتار، اسی معیار سے چلتی رہتی ہیں۔"(۶۷)

بیگم اختر ریاض الدین نے جنس نگاری کے موضوعات پر زیادہ کھل کے بات نہیں کی۔ تاہم "گوروں کے دیس میں" مصنف نے جنس نگاری کے موضوعات کو تسلسل سے بیان کیا ہے۔

"دھنک پر قدم" میں برطانیہ میں ہونے والے مختلف تھیٹروں کا احوال بیان کیا گیا ہے جبکہ عطاء الحق قاسمی نے تھیٹروں کا اپنے سفر نامے میں ذکر نہیں کیا۔ بیگم اختر ریاض الدین تھیٹروں میں پیش ہونے والے ڈراموں اور فنکاروں کی تفصیل بتاتی ہیں۔ انہوں نے یہاں کے تھیٹروں میں دکھائے جانے والے ڈراموں کو بہت پسند کیا ہے۔ مصنفہ برطانوی ڈراموں کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

"آٹھ دس شلنگ میں خاصی اچھی نشست مل جاتی تھی اور لندن کا معمولی ڈرامہ بھی اور ملکوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ یہ عجیب ہے کہ انگلستان میں فلموں پر زبردست اخلاقی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ لیکن تھیٹر کو سینسر نے کھلی آزادی دے رکھی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی عریانی ایسی نہیں جو سلیقے سے سٹیج پر پیش نہ ہو سکے۔"(۶۸)

عطاء الحق قاسمی نے برطانوی معاشرے کے سماجی آداب کو بہت سراہا۔ ان کے مشاہدے میں آتا ہے۔ کہ اہل مغرب گھورنے کو انتہائی ناپسند کرتے ہیں۔ وہ جب بھی ملتے ہیں تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ وہ الوداع ہوتے ہوئے شکریہ لازماً کہیں گے۔ وہ سماجی آداب کو ہر صورت بجالانے کی کوشش کریں گے۔ بیگم اختر ریاض الدین مغربی ثقافت کی دلدادہ لگتی ہیں اور عطاء الحق قاسمی کو مشرقی ثقافت سے عشق ہے۔

حوالہ جات

۱۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی،۱۹۸۷ء، ص ۱۷۵

۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، یورپ کا عروج، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲

۳۔ اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۵۲

۴۔ ایضاً، ص ۵۷

۵۔ ایضاً، ص ۶۰

۶۔ ایضاً، ص ۶۵

۷۔ ایضاً، ص ۷۰

۸۔ ایضاً، ص ۶۳

۹۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۶۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۰-۶۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۲۔ ایضاً، ص ۶۲

۲۳۔ ایضاً، ص ۶۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۶۷

۲۵۔ ایضاً، ص ۶۹

۲۶۔ عطاءالحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۷

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۲

۲۹۔ ایضاً، ص ۶۸

۳۰۔ ایضاً، ص ۶۹

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۲۹-۱۳۰

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۴

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۹۸

۳۴۔ ایضاً، ص ۸۲

۳۵۔ ایضاً، ص ۵۰

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۲۸

۳۷۔ ایضاً، ص ۵۴

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۸

۳۹۔ ایضاً، ص ۸۴

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۴۱۔ ایضاً، ص ۴۰

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۱

۴۳۔ ایضاً، ص ۴۸

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۶

۴۵۔ ایضاً، ص ۴۷

۴۶۔ ایضاً، ص ۲۴

۴۷۔ ایضاً، ص ۳۲

۴۸۔ ایضاً، ص ۲۷۵

۴۹۔ ایضاً، ص ۲۲

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۵۱۔ ایضاً، ص ۵۱

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۰۲-۱۰۳

۵۳۔ ایضاً، ص ۶۸

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۸

۵۶۔ ایضاً، ص ۲۳۸

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۵۸۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۱۰۴

۵۹۔ اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، ص ۷۰

۶۰۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۱۰۸

۶۱۔ ایضاً، ص ۳۴

۶۲۔ اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، ص ۲۷

۶۳۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۳۹

۶۴۔ اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، ص ۶۰

۶۵۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، ص ۱۳۰

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۶۷۔ اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، ص ۶۵

۶۸۔ ایضاً، ص ۵

باب چہارم:

ماحصل

i. مجموعی جائزہ:

ادب بنی آدم کے لیے راہبر کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ ادب انسانی شعور اور عزم کی تشکیل میں عملی طور پر حصہ لیتا ہے۔ ادب ہر شعبہ ہائے زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ ادب سے وابستہ ہونا انسان کا فطری تقاضا ہے۔ زندہ قومیں اپنے تہذیب و ثقافت کو ہمیشہ اہمیت دیتی ہیں۔ ادب ایک بہت بڑی تہذیبی قدر ہے اور ایک ادیب قلم کی مدد سے خود اپنی تشریح کرتا ہے۔ ادب ایک باشعور نقاد بھی ہے جو اچھے اور برے میں تمیز سکھاتا ہے۔ انسان ابتدا سے ہی کہانی سننے سنانے کا ذوق رکھتا ہے۔ ناول، افسانے، ڈرامے اور داستان کی طرح سفر نامہ بھی ایک دلچسپ صنف ہے جو کہ غیر افسانوی ادب میں شمار ہوتا ہے۔

سفر نامہ ایک زندہ اور متحرک ادبی صنف ہے جو اعلیٰ اقدار کو اُجاگر کرتے ہوئے زندگی کو نئی راہوں سے روشناس کرتا ہے۔ اگر انسانی تہذیب کی تاریخ کو دیکھا جائے تو انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا غار اور پتھر سے کی۔ پھر انسان نے زرعی میدان میں ترقی کا سفر کیا اس کے بعد صنعتی میدان میں اپنا لوہا منوایا اور بعد ازاں انسان کا سفر خلاؤں میں بھی ہوا۔ یوں انسان کے ارتقا کی ساری کہانی سفر کے گرد ہی گھومتی نظر آتی ہے۔

سفر انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ سیاحت انسان کے ذہن کو وسعت اور پختگی عطا کرتی ہے۔ ایک سیاح جب کسی بھی خطے کے سفر کے بعد اس کی تہذیبی اور ثقافتی احوال اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات کو قلمبند کرتا ہے تو وہ سفر نامہ کہلاتا ہے اور سیاح خود سفر نامہ نگار بن جاتا ہے۔

سفر نامہ سے انسانی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے مشاہدے اور تجربے کو کام میں لاتے ہوئے قارئین کو مفید معلومات اور تہذیب و تمدن سے آگاہی فراہم کرتا ہے۔ مقالہ کی ابواب بندی کے بعد نتیجہ نکلتا ہے کہ سفر نامہ متعلقہ خطے کی تہذیب و ثقافت کی تصویر فراہم کرتا ہے اور ایک شخص گھر بیٹھے ہوئے اپنی کسی پسندیدہ خطے کے احوال سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔

اردو سفر نامے کی روایت کا تجزیہ کرنے سے ادراک ہوتا ہے کہ سفر نامہ کی ابتدا انیسویں صدی میں

ہوئی۔ ابتدائی سفر ناموں میں کسی علاقے کے محل وقوع اور رسم و رواج کا بیان زیادہ ہوتا تھا۔ پھر مذہبی سفر نامے لکھنے کی رویت پروان چڑھی۔ اس سے مذہبی معلومات کی فراہمی کے ساتھ اپنے مذہب کے ساتھ وابستگی مضبوط ہوتی تھی۔ قدیم سفر ناموں میں جغرافیائی اور تاریخی معلومات زیادہ جبکہ داخلی محسوسات کے بجائے خارجی معلومات زیادہ ہوتی تھیں۔

پھر بیسویں صدی میں نمایاں تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ اس صدی میں سفر نامے کی صنف نے خوب مقبولیت حاصل کرلی۔ اس صدی میں اردو سفر نامے میں نفسیات شناسی کا رجحان زیادہ ملتا ہے۔ جدید سفر نامہ نگاروں نے اپنے مخصوص اور پر کشش اسلوب کے ذریعے اس صنف کو دلچسپ اور شائستہ بنا دیا ہے۔ جدید سفر نامے کی ابتدا محمود نظامی سے ہوتی ہے۔ ان کا سفر نامہ قدیم اور جدید سفر ناموں میں حد فاضل قائم کرتا ہے۔

جدید سفر نامہ نگاروں میں بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ انہوں نے منفرد طریقے سے سفر نامہ نگاری میں مقبولیت حاصل کی۔ اپنے اپنے مخصوص انداز کے ذریعے نہ صرف سفر نامے کی روایت کو مضبوط کیا بلکہ سفر نامے کی صنف کو نیا آہنگ دیا۔ ان کے سفر نامے دلچسپ ہونے کے ساتھ متعلقہ خطے کی تہذیب اور ثقافت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ دونوں سفر نامہ نگاروں نے اپنے صحافتی تجربات سے بھی استفادہ کیا۔ انہوں نے اپنے دلچسپ طنز و مزاح کے ذریعے سفر نامے کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ اس مقالے کے لیے اختر ریاض الدین کے سفر نامے "دھنک پر قدم" اور عطاء الحق قاسمی کے سفر نامے "گوروں کے دیس میں" کا انتخاب کیا گیا۔

بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی نے برطانیہ کے سماجی نظریات کا تجزیہ کیا ہے۔ بعض پہلوؤں پر دونوں کے نظریات ملتے ہیں اور کہیں کہیں اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے وہاں کے خاندانی نظام، طرز معاشرت اور نظام سیاست کا باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے اور اپنے مشاہدے کی بنا پر واقعات اور مناظر فطرت کو اپنے سفر نامے کی زینت بنایا۔ دونوں کے مشاہدے میں آتا ہے کہ اہل مغرب نے عورت کو سماجی، سیاسی اور معاشی آزادی تو دے دی ہے لیکن اس آزادی کے نام پر عورت کا خوب استحصال بھی کیا ہے۔ اگرچہ عورت نے ہر شعبے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے تاہم مجموعی طور پر عورت ظلم و ستم کا شکار ہے۔ مغرب

میں خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ وہاں طلاقوں کا رواج زیادہ ہے جس کا زیادہ نقصان بچوں کو اُٹھانا پڑتا ہے جو اپنے والدین کی شفقت و محبت سے محروم رہتے ہیں۔ پھر یہاں کے بوڑھوں کو سینئر سٹیزن کہہ کر اولڈ پیپل ہوم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ان مراکز میں حکومت ان کو تمام تر سہولیات فراہم کرتی ہے لیکن اخلاقی قدروں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستانی معاشرے میں بوڑھوں کا احترام کیا جاتا ہے اور ان کی مناسب دیکھ بھال کو اوّلین فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ بظاہر ترقی یافتہ نظر آنے والے اس معاشرے نے بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی زندگیوں کو شدید مسائل کا شکار کیا ہوا ہے۔

بیگم اختر ریاض الدین برطانوی شاہی زندگی سے حد درجہ متاثر نظر آتیں ہیں۔ انہوں نے اپنے سفر نامے میں مختلف شاہی عمارات اور شاہی تقریبات کا ذکر خوبصورت انداز سے کیا ہے۔ برطانیہ میں اگرچہ اب پارلیمانی نظام حکومت ہے اور بادشاہی نظام وقت کے ساتھ اختتام پذیر ہو چکا ہے تاہم برطانیہ کے لوگ اب بھی ملکہ کا احترام کرتے اور اسے اتحاد کی علامت قرار دیتے ہیں۔ ملکہ کے ساتھ گہری وابستگی ان کی روایات کا لازمی حصہ بن چکی ہے۔

سرمایہ درانہ نظام کی وجہ سے یہاں اہل مغرب نے خوب ترقی کی ہے اور ہر شعبہ ہائے زندگی میں عروج حاصل کیا ہے وہیں اس نظام نے انسانی آزادیوں کو بھی سلب کر لیا ہے۔ یہاں کے صنعتکار شہریوں کو کریڈٹ کارڈز کی سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ ان کریڈٹ کارڈز کی مدد سے شہری ایک مقررہ حد تک خریداری کر سکتے ہیں۔ پھر قرض کی ادائیگی کے لیے شب و روز کام کرتے ہیں۔ ان کا حال ہمارے ہاں کے بھٹہ مزدوروں جیسا ہو گیا ہے جن کو بھٹہ مالکان ایڈوانس رقم دیتے ہیں جو وہ تاحیات ادا نہیں کر سکتے اور یہ غلامی کی زنجیر ان کے پاؤں میں تاحیات رہتی ہے۔ سرمایہ درانہ نظام وقت کے ساتھ انسان کو اپنے شکنجے میں کس لیتا ہے۔ ترقی اور خوشحالی کے باوجود یہ معاشرہ روحانی مسائل کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔

برطانیہ میں تقریباً ۷۶ فیصد مسیحی آباد ہیں۔ یہاں کے لوگ مذہب سے بیزار ہو چکے ہیں کلیسا کو اہم اور مرکزی حیثیت حاصل تھی لیکن وقت کے ساتھ اس کے اختیارات کم ہوتے چلے گئے۔ تاہم اب بھی پادریوں کو عزت حاصل ہے۔ مذہب سے دوری کے باعث وہ روحانی مسائل کا شکار ہیں۔

برطانیہ میں مقیم پاکستانی اپنے مذہبی اقدار پر پوری طرح سے کاربند ہیں۔ اس مادہ پرست معاشرے

میں رہتے ہوئے بھی وہ مغربی تہذیب کی یلغار کا شکار نہیں ہوئے۔ یہاں جو شخص مذہب سے وابستہ ہیں۔ وہ پاکستانیوں کی نسبت زیادہ مذہب کو سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ وہ منافقت سے کوسوں دور ہیں۔ وہ جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں۔ فرقہ واریت کو یہاں پنپنے نہیں دیا جاتا۔ لیکن دوسری طرف اس بات کے خطرات لاحق ہیں کہ کہیں یہ مغربی تہذیب کے زیر اثر نہ آجائیں۔ اس حوالے سے یہاں کے بسنے والے مسلمانوں کو راست اقدامات کرنا ہوں گے اور اپنے بچوں کے مستقبل کے حوالے سے سوچ بچار کرنا ہوگی اور انہیں اپنی روایات سے جڑا رہنا سکھانا ہوگا۔ یہ بات انتہائی خوش آئند ہے کہ برطانیہ میں مقیم پاکستانی اپنے وطن سے آنے والے بھائیوں کو خلوص دل سے خوش آمدید کہتے اور ان کی مہمان نوازی کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ مغرب میں رہائش پذیر پاکستانی اپنے مذہبی اور ثقافتی تہوار اس قدر جوش و خروش سے مناتے ہیں کہ وطن سے دوری کا احساس نہیں ہوتا۔ ان تہواروں کو مناتے ہوئے اپنی روایات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ ان مذہبی تہواروں پر خصوصاً عبادات بجالاتے اور ضیافتوں کا اہتمام کرتے ہیں۔

برطانیہ میں کچھ شہر ایسے بھی ہیں جہاں پاکستانی اور ہندوستانی اکثریت جبکہ انگریز اقلیت میں ہیں۔ جس کی وجہ سے یہاں اردو زبان بہت مقبول ہے۔ ایک عام اندازے کے مطابق برطانیہ میں بولی جانے والی زبانوں میں اردو تیسرے نمبر پر ہے۔ کئی مقامات پر سائن بورڈ بھی اردو میں لگے نظر آتے ہیں۔ مختلف کتب خانے بھی قائم ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اردو کے حوالے سے فکر مند بھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کچھ پاکستانی ایسے بھی ہیں جو کہ احساس کمتری کا شکار ہیں۔ یہ انگریزی کو پسند کرتے اور اپنے بچوں کو انگریزی بولتا دیکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

برطانیہ میں قانون سب کے لیے ایک ہے۔ ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی ہے۔ جنس کی بنا امتیاز نہیں برتا جاتا۔ رشوت اور سفارش جیسی برائیاں اس معاشرے میں ناپید ہیں۔ سیاسی اور معاشی طور پر بھرپور آزادی حاصل ہے۔ ہر شخص قانون کی پیروی کرتا ہے۔ دونوں سفر نامہ نگار خواہش کرتے ہیں کہ یہ اعلیٰ اقدار ہمارے ملک میں بھی ہونی چاہییں۔

برطانیہ میں سکھوں اور ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد آباد ہے۔ سکھ اپنی اقدار و روایات کے ساتھ ہمیشہ جڑے رہتے ہیں۔ یہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں چلے جائیں۔ یہ آپ کو اپنے مخصوص لباس، سر پر پگڑھی پہنے،

چہرے پہ داڑھی سجائے اور اپنی مخصوص پنجابی زبان بولتے نظر آئیں گے۔ دونوں سفر نامہ نگار یہاں بسنے والے ہندوؤں کی طرزِ معاشرت سے کس قدر پریشان ہیں کہ انہوں نے اپنی اقدار کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اپنانے میں فخر محسوس کیا ہے۔

انگریز قوم دوغلے پن کا شکار بھی ہے۔ مشاہدے میں آتا ہے کہ کچھ نسل پرست لوگ بھی ہیں۔ یہ اپنے آپ کو نسلی اور لسانی اعتبار سے ایشیائی ممالک کے باشندوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ان کو اپنے رنگ و نسل پر بہت زیادہ غرور ہے۔ یہ لوگ بعض اوقات ایشیائی باشندوں کو نقصان بھی پہنچاتے ہیں۔ اس حوالے سے اکثر قانون بھی خاموش رہتا ہے۔

مغرب کی تہذیب میں کئی تاریخی عناصر ہیں۔ یہ عناصر اس تہذیب کے شاندار ماضی کے عکاس بھی ہیں۔ برٹش میوزیم کی شاندار عمارت اپنے اندر ایک مکمل تاریخ چھپائے ہوئے ہے۔ اس میں ۲۰ لاکھ سے زائد کتب رکھی گئی ہیں۔ سفر نامہ نگاروں نے مادام تساؤ کے عجائب گھر کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں شاہی خاندان اور مشہور و معروف شخصیات کے مومی مجسمے رکھے گئے ہیں۔ مشہور تاریخی شعراء شیکسپیئر اور ورڈز ورتھ کا تذکرہ بھی سفر ناموں میں موجود ہے۔ وہاں کے ہائیڈ پارک، لیک ڈسٹرکٹ، سینٹ پال گرجا گھر اور دوسری کئی تاریخی عمارات برطانوی تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں۔

اہلِ مغرب کو سیاحت کا بہت شوق ہے۔ یہاں قدرتی حسن کی فراوانی بھی ہے۔ یہاں کے پہاڑ اور دریا خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہاں کا خوبصورت موسم بھی سیاحت کا شوق بڑھا دیتا ہے۔ فطری حسن کی رعنائیاں جا بجا بکھری نظر آتی ہیں۔ چنانچہ یہاں کے لوگ پانچ دن کام کرتے اور دو دن خوب سیر و سیاحت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ باہر سے بھی بہت زیادہ سیاح آتے ہیں جو کہ ملک کے زرِ مبادلہ کے ذخائر میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔ مغرب کے لوگوں کو باغبانی کا بہت شوق ہے۔ ان کے گھروں کے باہر اکثر چھوٹے چھوٹے باغیچے نظر آتے ہیں۔

اس معاشرے میں ہم جنس پرستی اور عصمت فروشی کی برائیاں عام ہیں۔ جس کی وجہ سے اہلِ مغرب کو اکثر شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان عناصر نے مغربی تہذیب پر بدنما دھبے لگائے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہاں کے صنعتکار بھی ہیں۔ یہ اپنی مصنوعات بیچنے کے لیے باقاعدہ اس کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ بڑے

بڑے کنونشن منعقد کیے جاتے ہیں جن میں ہم جنس پرستی کو فلسفیانہ طریقے سے پیش کیا جاتا اور فوائد گنوائے جاتے ہیں۔ یہ جنسی بے راہ روی کو خوشنما رنگوں میں پیش کرتے ہیں۔

اہل مغرب جوئے کی لت کا بری طرح شکار ہیں۔ یہاں اس کے باقاعدہ مراکز کھلے ہوئے ہیں جن میں جواء شدومد سے کھیلا اور کھیلایا جاتا ہے۔ کبھی گھوڑوں کی ریس پہ جوا ہو رہا ہوتا ہے تو کبھی کتوں کی لڑائی پہ۔ اس کے علاوہ مختلف تہواروں اور نمائشوں کے موقع پر جوئے کا خصوصاً اہتمام کیا جاتا ہے۔ سرکاری سطح پر اس حوالے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

مغرب کے دیہات اپنے اندر بے شمار خوبصورتیاں لیے ہوئے ہیں۔ یہاں کے دیہات پاکستانی دیہاتوں کی طرح خوبصورت ہیں۔ یہاں کے دیہاتی لوگ بہت زیادہ مہمان نواز اور سادہ زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ یہ آپس میں مل جل کے رہتے اور محنت پر یقین رکھتے ہیں۔ الغرض برطانیہ کی دیہی طرزِ زندگی سیاحوں کے لیے پرکشش ہے۔

برطانیہ میں رسم و رواج کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یہاں کا تین چوتھائی آئین بھی رسم و رواج اور روایات پر مبنی ہے۔ یہ لوگ اپنی اقدار کا خیال کرتے اور ان سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔

برطانیہ کے شہری فاسٹ فوڈز کے دلدادہ ہیں۔ بیگم اختر ریاض الدین کے مشاہدے میں آتا ہے کہ برطانوی قوم جو کبھی مرچ مصالحے اور چٹ پٹے کھانوں سے اجتناب کرتی تھی۔ لیکن اب لندن کے مختلف ریستورانوں میں اس طرح کے کھانے آسانی سے دستیاب ہیں اور یہاں کے مقامی باشندے مزے سے یہ چٹ پٹے کھانے تناول کر رہے ہوتے ہیں۔ انگریز ایک طویل عرصے تک ہندوستان پر قابض رہے چنانچہ یہاں کی کچھ ثقافتی اثرات اس قوم پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔

یہ قوم بہت زیادہ فیشن زدہ ہے۔ گورے رنگ کے ساتھ ان کی خوش لباسی ان کی نفاست دیکھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔ یہاں ہیٹ پہننے کا کلچر بھی ہے۔ اکثر مرد و خواتین ہیٹ پہنے نظر آئیں گے۔ سفر نامہ نگار کہیں کہیں ان کے ملبوسات پر تنقید کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہاں خواتین جو لباس پہنتی ہیں وہ جنسی رجحان کو فروغ دیتا ہے۔

اہل مغرب بہت سی مثبت اقدار کو اپنائے ہوئے ہیں۔ انہی اقدار میں سے کتب بینی اور قطار بندی بھی

ہے۔ یہ لوگ کتاب سے انتہائی لگاؤ رکھتے ہیں جس کا اظہار اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ لوگ اکثر سفر کے دوران کتاب پڑھتے نظر آئیں گے۔ اس قوم کی ترقی کا ایک راز کتاب سے گہری محبت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے یہاں کتب خانے بہت زیادہ ہیں۔ ہزاروں مرد و خواتین ان کتب خانوں سے روزانہ کتابیں پڑھنے کے لیے لیتے ہیں۔ یہ ہر کام کو اتنی نفاست سے کرتے ہیں کہ وہ اس قوم کی پہچان بن جاتا ہے۔ اپنی زندگیوں کو سلیقے سے گزارنے کے قائل ہیں۔ یہ مختلف مقامات پر آپ کو قطار بنائے نظر آئیں گے۔

یہاں کا تھیٹر اور اس میں پیش کیے جانے والے ڈرامے دنیا بھر میں مقبول ہیں۔ برطانیہ کی سیر کرنے والے سیاح ان سے لازماً لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ تھیٹر برطانوی ثقافت کو نمایاں کرتے ہیں۔ تفریح کے ساتھ یہ ثقافت کو اگلی نسلوں تک منتقلی کا سبب بھی بنتے ہیں۔

برطانوی میلے اور تہوار خصوصی دلچسپی کے حامل ہیں۔ یہاں میلوں کی سرکاری سطح پر سرپرستی کی جاتی ہے۔ ان میلوں میں اکثر شاہی خاندان کے افراد بھی شریک ہوتے ہیں۔ لوگ جوش و خروش کے ساتھ ان میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ تفریحی سرگرمیاں ایک طرف روزمرہ کی اکتاہٹ والی زندگی سے نکلنے اور تسکین کا موجب ہیں تو دوسری طرف یہ برطانوی ثقافت کو بین الاقوامی سطح تک فروغ دیتی ہیں۔ پھر یہاں مختلف طرح کی نمائشوں کا انعقاد بھی ہوتا ہے۔ پھولوں کی نمائش بھی منعقد ہوتی ہے جس سے فطرت کی رنگینیوں کو نزدیک سے دیکھا جا سکتا ہے۔

برطانیہ میں گھروں کی تعمیر میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہاں عام طور پر کثیر منزلہ عمارتیں ہیں۔ گھروں میں زیبائش و آرائش کا خصوصی انتظام ہوتا ہے۔ جس طرح ان کے چہرے صاف ستھرے اور نفیس ہیں ایسے ہی ان کے گھر بھی نفاست سے بھرپور ہیں۔ ہر گھر میں ڈرائنگ روم خاص طور پر بنایا جاتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ مغرب میں گھروں کے اندر غسل خانے بنانے کا رواج نہ تھا لیکن اب ہر گھر میں غسل خانے کی سہولت موجود ہے۔ شہروں کے اندر گھر عام طور پر تنگ و تاریک لیکن صاف اور دلکش ہیں۔

برطانیہ کی سڑکیں صاف ستھری اور کھلی ہیں۔ یہاں پر قانون کو توڑا نہیں جاتا۔ سڑکوں کے اطراف میں تمام مناسب سہولیات دستیاب ہیں۔ دونوں سفر نامہ نگار اس کا تقابل پاکستان کی سڑکوں سے بھی کرتے ہیں۔ نہ تو سڑکیں اعلیٰ معیار کی ہیں اور نہ ہی یہاں قوانین کا احترام کیا جاتا ہے۔ آمد و رفت کے بہتر ذرائع کسی

بھی ملک کی ترقی اور خوشحالی کی ضمانت ہیں۔

برطانوی قوم فنون لطیفہ سے انتہا درجہ لگاؤ رکھتی ہے۔ یہ فن اور فنکار دونوں سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں کے عجائب گھر اس کے بھرپور عکاس ہیں۔ یہ عجائب گھر مغرب کی تہذیب وثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی سیر کرتے ہوئے بندہ تاریخ کے جھروکوں میں گم ہو جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے سفر نامے میں جنس نگاری کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ جنس مغرب کا خاصا ہے اور کسی تہذیب کی عکاسی سفر نامے کا خاصا ہے۔ اسی سبب سفر نامہ نگار کے ہاں جنس نگاری کا پہلو نمایاں ہے۔ ان کا قلم محض چٹخارے نہیں لیتا بلکہ وہ مغربی معاشرے کا اصل چہرہ قارئین کے سامنے لاتے ہیں۔ ان کے سفر نامے میں جنس اور زندہ دلی جابجا بکھری ہوئی ہے۔ وہ واقعات اور مناظر کو بڑے فنکارانہ انداز میں مکمل تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ غسل آفتابی اہل مغرب کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہاں کے مقامی باشندے قطار در قطار گھاس پر لیٹ جاتے اور موسم سے لطف اٹھاتے ہیں۔

شراب نوشی کا کلچر مغربی معاشرے میں عام ہے۔ مختلف تقریبات کے موقعوں پر اس کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اس چیز کو انتہائی معیوب تصور کیا جاتا ہے لیکن مغربی معاشرے میں یہ تفریح کا ایک ذریعہ بن چکا ہے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ اکثر خواتین بھی شراب نوشی کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے بہت سی برائیاں جنم لے رہی ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس ایک مسلم تہذیب کے اندر شراب نوشی ممنوع ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے سفر یورپ کا ایک مقصد یہاں مختلف مشاعروں میں شرکت کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں ان مشاعروں کے احوال کا تذکرہ کیا ہے۔ ان مشاعروں میں شرکت کرنے والے پاکستان اور ہندوستانی اپنی مخصوص ثقافتی جھلک پیش کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار مطمئن لگتا ہے کہ برطانیہ میں مقیم پاکستانی مغربی تہذیب کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ ان مشاعروں کو تواتر سے ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے نہ صرف اردو زبان کو فروغ ملے گا بلکہ یہ مشاعرے تفریح کے ساتھ اپنی ثقافتی اقدار کو بھی اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔

اہل مغرب دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ یہاں گھورنے کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ علم اور اہل علم کی قدردان ہیں۔ اگر ان سے کوئی خطا ہو جائے تو اسے کھلے دل سے نہ صرف

تسلیم کرتے بلکہ اس کا ازالہ کرتے ہیں۔ یہ جب بھی ملیں گے ہمیشہ مسکرا کر ملیں گے اور ملاقات کے وقت اپنے مخصوص آداب اور روایات کی پاسداری کریں گے۔

مجموعی طور پر دونوں سفر نامہ نگاروں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں مغربی طرزِ زندگی کا جائزہ لیا۔ دونوں سفر نامہ نگاروں نے مغربی تہذیب و ثقافت کے بہت سے عناصر کا تجزیہ کیا اور ان کو اپنے سفر نامے کی زینت بنایا۔ وہ اہل مغرب کی مثبت اقدار سے روشناس کراتے ہوئے ان کو سراہتے بھی ہیں۔ وہ اس تہذیب کے منفی پہلوؤں کے اثرات سامنے لا کر ان سے بچنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ دونوں سفر نامہ نگار اپنی اپنی کاوش میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

ii. نتائج:

دوران تحقیق مندرجہ ذیل تحقیقی نتائج سامنے آئے ہیں۔

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں سماجی، مذہبی، نسلی، لسانی اور تاریخی حوالے سے تہذیبی پہلوؤں کو اپنے اپنے انداز سے پیش کیا ہے۔ مذہبی اقدار کو بیان کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی کا قلم رواں ہو جاتا ہے جبکہ بیگم اختر ریاض الدین کے ہاں مذہبی عناصر کی پیشکش کے وقت ایک مخصوص طنز نظر آتا ہے۔

۲۔ دونوں سفر نامہ نگاروں نے ثقافتی عناصر کو خوبی سے بیان کیا ہے۔ بیگم اختر ریاض الدین کا مغرب کی ثقافتی سرگرمیوں کی طرف میلان بہت زیادہ ہے۔ وہ یہاں کے تہواروں کا احوال تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہیں جبکہ عطاء الحق قاسمی نے اہل مغرب کے رہن سہن کو تنقیدی نگاہ سے بیان کیا ہے۔

۳۔ بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر یورپ کے دوران وہاں کے تہذیب و ثقافت، سماجی روابط اور رہن سہن کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا اور دونوں نے اپنی بصیرت اور تجربے کے مطابق انھیں اپنے اپنے سفر نامے میں پیش کیا۔ کچھ معاملات، مشاہدات اور رجحانات میں دونوں کے خیالات مشترک ہیں۔ تاہم کہیں کہیں اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ دونوں سفر نامہ نگار مغرب کی اعلیٰ اخلاقی اقدار، سفارش اور رشوت جیسی برائیوں سے نفرت، میرٹ کا نفاذ اور ایمانداری کے کلچر کا فروغ جیسی اقدار کی تعریف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بیگم اختر ریاض الدین کو یورپ کے شاندار طرز زندگی نے متاثر کیا لیکن عطاء الحق قاسمی وہاں کی طرز معاشرت اور طرز فکر پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔

iii. سفارشات

۱۔ بیگم اختر ریاض الدین اور عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں کا اسلوب بہت سے فنی محاسن لیے ہوئے ہے۔اس حوالے سے تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

۲ عطاء الحق قاسمی عصر حاضر کے شاعر بھی ہیں اور ان کے سفر ناموں میں شاعری کے عناصر ہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے ان تحقیقی کام کرنا چاہیے۔

۳۔ یہ دونوں سفر نامے "دھنک پر قدم" اور گوروں کے دیس میں" مغربی تہذیب و ثقافت کے عکاس ہیں۔ جبکہ کچھ سفر نامے ایسے بھی لکھے گئے جو کہ پاکستانی تہذیب و ثقافت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چنانچہ برطانوی اور پاکستانی ثقافت کا تقابل ہو سکتا ہے۔

۴۔ بیگم اختر ریاض الدین کے سفر ناموں میں سیاسی اور تاریخی عناصر بہت زیادہ ہیں۔ اس نقطہ نظر سے ان پر تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

۵۔ عطاء الحق قاسمی کے سفر ناموں میں جنس نگاری کے عناصر نمایاں ہیں۔ ان کے سفر ناموں پر اس حوالے سے تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۲۰۱۶ء

عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

ثانوی ماخذ:

ابوذر عثمانی، اسالیب نثر، پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ، ۱۹۷۸ء

اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، عطاء الحق قاسمی: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء

تحسین فراقی، (مقدمہ) عجائبات فرنگ از یوسف خان کمبل پوش، مکہ بکس، لاہور، ۱۹۸۳ء

جمیل احمد انجم، ڈاکٹر، اردو ادب، علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۴ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

حسن اختر ملک، ڈاکٹر، تہذیب و تحقیق، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۵ء

خالد محمود، ڈاکٹر، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

سبطِ حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۴ء

سجاد باقر رضوی، تہذیب و تخلیق، مکتبہ ادب جدید، لاہور، ۱۹۹۹ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، (دیباچہ) "ڈاکٹر" عطاء الحق قاسمی، غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور، از عطاء الحق قاسمی، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۷ء

سید احمد خان، سر، مسافران لندن، مرتبہ اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء

سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اسلامی تہذیب، مضمون مشمولہ اسلامی تہذیب و ثقافت، دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

سید عبد اللہ، ڈاکٹر، ادب و فن، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء

عبد الرحمان، منشی، مضمون اسلامی ثقافت کا مسئلہ، مشمولہ "اسلامی تہذیب و ثقافت" مرتبہ ڈاکٹر عطش درانی، شاخ زریں، لاہور، ۱۹۸۶ء

عطش درانی، ڈاکٹر، اسلامی فکر و ثقافت، منظور پریس، لاہور، ۱۹۸۷ء

فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۲ء
فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، شاداب موسموں کی آواز، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۹ء
فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، پرنٹنگ پریس محل ناظم آباد، کراچی، ۱۹۷۶ء
قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء
کرار حسین، پروفیسر، سوالات وخیالات، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۸ء
محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، مضمون "کلچر۔ ایک ارتقاء" مشمولہ کلچر منتخب تنقیدی مضامین، مرتبہ اشتیاق احمد بیت الحکمت، لاہور، ۱۹۹۵ء
محمد سعید، حکیم، افکار واشخاص، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی، ۱۹۹۲ء
محمد کلیم اختر، چاند چہرے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء
مختار الدین، ڈاکٹر، (فلیپ)، آج بھی اس دیس میں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء
وارث سرہندی، زبان وبیان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
وزیر آغا، ڈاکٹر، معنی اور تناظر، مکتبہ نردبان، سرگودھا، ۱۹۹۸ء

انٹرنیٹ:

Encyclopedia of Britannica, 15thEdition, USA, 1982,Vol:4 ۱۰جون۲۰۱۹ء 4:00

wikipedia.org/wiki/travel_literatur ۲۵جولائی۲۰۱۹ء 3:30 pm

لغات:

اردو لغت، جلد پنجم، مرتبہ سعید اے شیخ، رابعہ بک ہاؤس، کراچی، ۱۹۸۳ء
عبدالحفیظ بلیاوی، مولانا، (مترجم)، المنجد، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۹ء

رسائل وجرائد:

صدف فاطمہ، ڈاکٹر، اختر ریاض الدین اور "سات سمندر پار"، (مضمون) مطبوعہ: الماس، شمارہ ۱۸، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور، ۲۰۱۶ء
مرزا ادیب، سفرنامہ (مضمون) مطبوعہ: اوراق، شمارہ ۷، دفتر اوراق، لاہور، ۱۹۷۹ء
نفیسہ حق، سفرنامہ، فن اور جواز، (مضمون) مطبوعہ: الذبیر، شمارہ ۵، اردو اکادمی، بہاولپور، ۱۹۶۲ء